ಕರ್ನಾಟಕ ರಾಜ್ಯ ಮುಕ್ತ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾನಿಲಯ
ಮುಕ್ತಗಂಗೋತ್ರಿ, ಮೈಸೂರು – ೫೭೦ ೦೦೬

KARNATAKA STATE OPEN UNIVERSITY
Mukthagangothri, Mysore - 570 006

MA (Previous) Urdu

Course - II - Urdu Prose

Block 1-3 (Units : 1-4, 5-8, 9-12)

شاہد احمد دہلوی

پطرس بخاری

ایم اے: سال اوّل: اُردو

کورس۔2: اردو نثر

حصہ 1-3: اکائیاں: 1-4, 5-8, 9-12

رشید احمد صدیقی

Karnataka State Open University

Mukthagangotri, Mysore - 570 006

The Open University system has been initiated in order to augment opportunities for higher education and as an instrument of democratizing education.

National Education Policy 1986

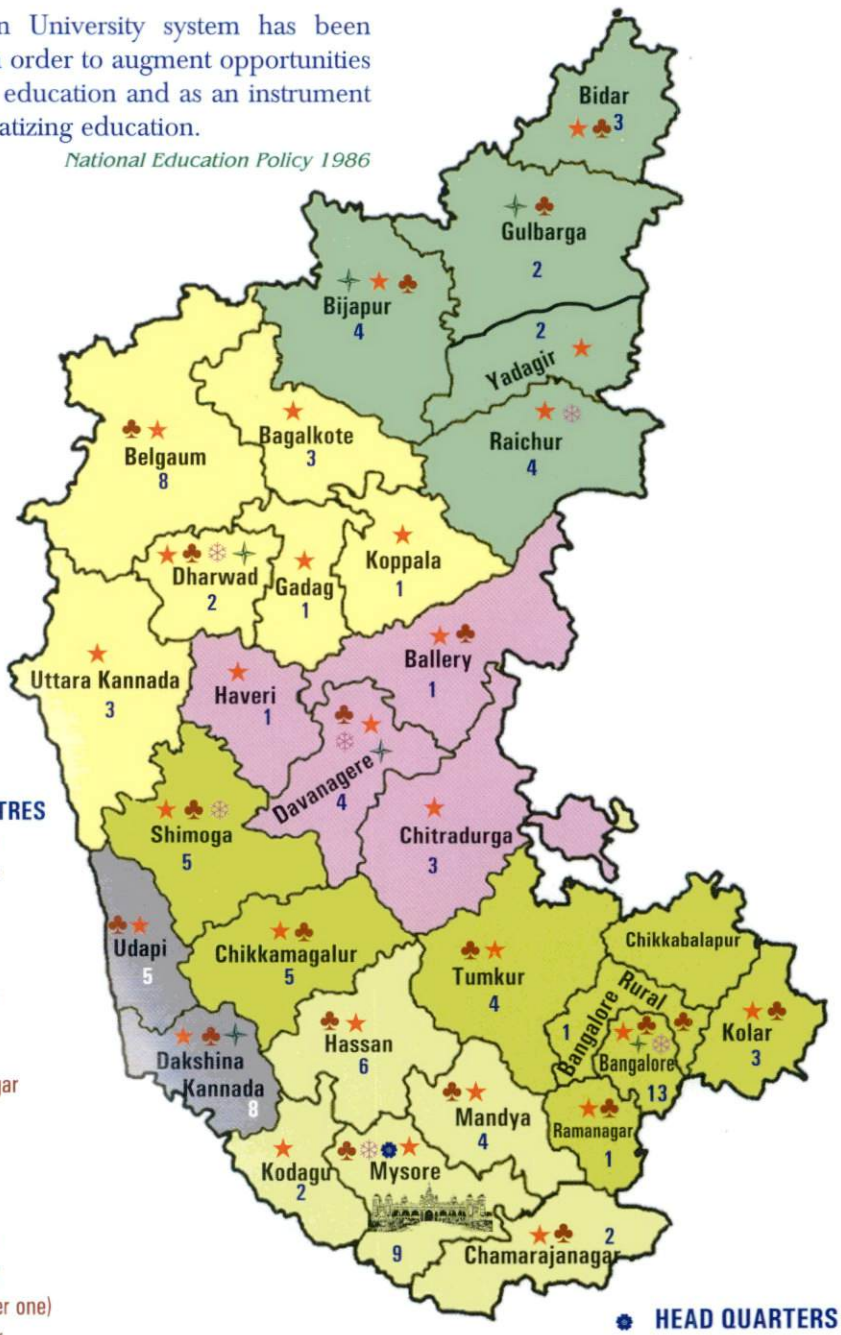

REGIONAL CENTRES

Bangalore
Davanagere
Gulbarga
Dharwad
Shimoga
Mangalore
Tumkur
Hassan
Chamarajanagar
Bellary
Mandya
Kolar
Bijapur
Belagaum
Ramanagar
Bangalore (another one)
Chikmagalur
Udupi
Karwar
Bidar
Mysore

HEAD QUARTERS

Total Study Centres : 123

Regional Centres : 21

B.Ed Study Centres : 10

M.Ed Study Centres : 06

Karnataka State Open University

Muktha Gangothri, Mysore - 570 006

کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی

مکتا گنگوتری، میسور

MA (Previous) Urdu

Course - II - Urdu Prose

Block 1-3 (Units : 1-4, 5-8, 9-12)

ایم اے: سال اوّل: اُردو

کورس۔2: اردو نثر

حصہ 1-3: اکائیاں: 1-4, 5-8, 9-12

MA (Previous) Urdu

Course - II - Urdu Prose

Block 1-3 (Units : 1-4, 5-8, 9-12)

ایم اے: سال اوّل: اُردو

کورس۔2: اردو نثر

حصہ 1-3: اکائیاں: 1-4, 5-8, 9-12

۱۔وائس چانسلر:

پروفیسر ایم جی کرشنن

۲۔ڈین اکاڈمک:

پروفیسر یس ین وکرم راجے ارس

۳۔رجسٹرار:

پروفیسر پی یس نائک

۴۔فیکلٹی ممبر:

بلقیس بانو ایم، صدر شعبہء اردو، کے یس او یو، میسور

۵۔مصنفین:

۱۔**ڈاکٹر یس مسعود سراج**، پروفیسر و صدر، شعبہء اردو، جامعہ میسور، اکائیاں:5,6,7,1-4

۲۔**ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید**، موظف پروفیسر، حیدر آباد، اکائیاں:8-12

٦۔مدیران:

۱۔**ڈاکٹر اشرف رفیع**، موظف پروفیسر، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، اکائیاں:5,6,7,1-4

۲۔**ڈاکٹر یس مسعود سراج**، پروفیسر و صدر، شعبہء اردو، جامعہ میسور، اکائیاں:8-12

نصاب کا مقصد

موجودہ دور میں اردو ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے مگر آج یہ ایک عظیم زبان کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے ادب سے ہوتا ہے، اور اس کا ادب معیار و مقدار کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ اور عمیق ادب ہے۔

مغربی ادب کے زیر اثر اور جدید دور کے تقاضوں کے پیش نظر اردو نظم / نثر نے خوب ترقی کی، چنانچہ نظم و نثر دونوں میں اس کے متعدد نمونے ابتداء ہی سے ملتے ہیں، دکن اور شمال کے حکمران اور عوام دونوں نے مل کر اردو زبان و ادب کو سینچا اور پروان چڑھایا، اردو نظم اور نثر مغربی اور مشرقی علوم و فنون کا سنگم بن گئے، نثر میں خصوصاً سیرت و سوانح، ناول و افسانہ، تمثیل نگاری مقالہ نویسی، تحقیق و تنقید صحافت خطابت خودنوشت سوانح نگاری انشائیہ، خاکہ نویسی وغیرہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور ہر شعبہء فن میں کسی نہ کسی نے خوب نام کمایا اور اس فن کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

یہ کتاب اردو نثر کے لئے مخصوص ہے یہ نصاب کا ایک جزو ہے، جو سال اول کے کورس دو اردو نثر کے لئے مخصوص ہے، اس باب میں کتاب سب رس مصنف ملا وجہی کی تخلیق کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ کورس کا پہلا باب یعنی بلاک ہے، یہ باب ا تا ۴ اکائیاں، یعنی کل چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔

دوسرا حصہ پہلے حصے کا مسلسل ہے، اس باب میں پہلی تین اکائیاں یعنی اکائی 7-5 میں سب رس پر مزید معلومات حاصل کریں گے، اور اکائی ۸ میں آشفتہ بیانی میری: مصنف رشید احمد صدیقی، کے متعلق معلومات حاصل کریں گے، یہ باب یا حصہ اکائیاں 8-5 پر مشتمل ہے۔

تیسرے حصہ میں دوسرے حصے کا سلسلہ ہے، یعنی اس باب میں آشفتہ بیانی میری مصنف رشید احمد صدیقی کے متعلق مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کئے گئے ہیں، یہ باب 12-9 اکائیوں پر مشتمل ہے، یعنی کل چار اکائیاں ہیں۔

مذکورہ ابواب اردو نثر کے لئے مختص کئے گئے ہیں، سال اول ایم اے اردو کے کورس ۲ اردو نثر میں یہ نصاب شامل ہے، اس کے علاوہ ان ابواب یا حصوں میں طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے منتخب سوالات بھی دئے گئے ہیں تا کہ طلبہ اس سے مزید مستفید ہو سکیں، ہر اکائی میں مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کے معنی بھی دیئے گئے ہیں اور اکائی کے آخر میں سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، امید ہے کہ طلبہ انہیں حاصل کر کے پڑھیں گے اور مزید اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

باب ۱ ۔ :

بلاک (باب ۱) ایک اردو نثر یعنی سب رس مصنف ملا وجہی کے لئے مخصوص ہے، اس باب میں سب رس سے متعلق مختلف خصوصیات کو قلم بند کیا گیا ہے، 4-1 اکائیاں یعنی کل چار اکائیوں پر یہ باب مشتمل ہے۔

اکائی ۱ کے تحت وجہی کی حیات اور دکنی شعراء میں اس کی امتیازی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی ۲: کے تحت سب رس قصہ کا اجمالاً جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی ۳: کے تحت سب رس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے سبب تالیف کتاب اور تاریخ تصنیف کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی ۴: کے تحت سب رس کی لسانی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ۲ ۔ :

اردو نثر کورس ۲ کا ایک جزو ہے، جو سال اوّل ایم اے اردو کے کورس میں شامل ہے، یہ باب 8-5 یعنی کل چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔

اکائی ۵: کے تحت سب رس میں داستانی عناصر کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، اور دیگر معلومات بھی فراہم

کئے گئے ہیں۔

اکائی ۶: کے تحت وجہی کی انشائیہ نگاری اور انشائیہ پر معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔

اکائی ۷: کے تحت سب رس ایک تمثیل کے لحاظ سے اردو میں تمثیل نگاری اور سب رس بہ حیثیت تمثیل کے جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی ۸: کے تحت آشفتہ بیانی میری کے مصنف رشید احمد صدیقی کی کتاب کے موضوع کے لحاظ سے خودنوشت سوانح نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ۳ـ :

اردو نثر کورس ۲ کا ایک جزو ہے، جو سالِ اول ایم اے اردو کے کورس میں شامل ہے، یہ باب 12-9 یعنی کل چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔

اکائی ۹ کے تحت رشید احمد صدیقی حیات و خدمات کے تعلق سے حیات کے اہم گوشے اور ادبی خدمات پر تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی ۱۰: کے تحت رشید احمد صدیقی کی طرز تحریر کا جائزہ لیتے ہوئے دیگر نثر نگار یا ان کے معاصر ادباء کی طرز تحریر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

اکائی ۱۱: کے تحت آشفتہ بیانی میری کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کی علی گڈھ سے وابستگی یعنی طالب علمی کا زمانہ اور ان کا جذبہء عقیدت وغیرہ پر معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔

اکائی ۱۲ کے تحت پچھلی اکائی کا سلسلہ ہے، اس اکائی میں علیگڈھ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہاں کے مشاعرے وہاں کے کھیل کود وغیرہ پر تفصیلی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مذکورہ ابواب میں جتنی بھی اکائیاں ہیں ان میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، ہر اس اکائی سے متعلق دیگر تفصیلات پر بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں، تا کہ طلبہ کو اکائی کے سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو۔

مشمولات :

(Block1= 1-4 Units, No. of Pgs. 1-61)

کتاب: سب رس: مصنف؛ ملا وجہی

ا۔باب ایک: اکائیاں 4-1

ا۔وجہی کی حیات

۲۔سب رس کا قصہ

۳۔سب رس کا تجزیہ

۴۔سب رس کی لسانی خصوصیات

(Block2= 5-8 Units, No. of Pgs. 62-99)

باب۲(اکائیاں:8-5)

کتاب: سب رس مصنف: ملا وجہی

اکائی ۵: سب رس میں داستانی عناصر

اکائی ۶: وجہی کی انشائیہ نگاری

اکائی ۷: سب رس ایک تمثیل:

کتاب: آشفتہ بیانی میری: مصنف: رشید احمد صدیقی

اکائی ۸: اردو میں خودنوشت سوانح نگاری

(Block3= 9-12 Units, No. of Pgs. 100-145)

باب۳:(اکائیاں:12-9)

اکائی ۹: رشید احمد صدیقی کی حیات وخدمات

اکائی ۱۰: رشید احمد صدیقی کا اسلوب

اکائی ۱۱: آشفتہ بیانی میری: تنقیدی مطالعہ ۱

اکائی ۱۲: آشفتہ بیانی میری: تنقیدی مطالعہ ۲:

اکائی 1 وجہی کی حیات

ساخت:

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2 وجہی کی حیات

1.2.1 وجہی کا نام

1.2.2 وجہی کا سنہ پیدائش اور جائے پیدائش

1.2.3 محمد قلی قطب شاہ کا عہد

1.2.4 محمد قطب شاہ کا عہد

1.2.5 عبداللہ قطب شاہ کا عہد

1.2.6 وجہی کی وفات

1.2.7 عقائد

1.2.8 تصانیف

1.3 نمونہ امتحانی سوالات

1.4 خلاصہ

1.5 فرہنگ

1.6 سفارشی کتابیں

1.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائینگے کہ

☆ وجہی کا سنہ پیدائش

☆ نام

☆ دربار سے وابستگی

☆ عقاید

☆ تصانیف اور

☆ وفات سے واقفیت حاصل کر سکیں اور انہیں اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

1.1 تمہید

اس اکائی میں قطب شاہی عہد کے مہشور شاعر اور ادبی ملاّ وجہی کی حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وجہی نہ صرف قطب شاہی عہد کا بلکہ دکنی ادب کا ممتاز شاعر و ادیب ہے۔ اسے دکنی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اس اکائی میں آپ اس کی حیات کے اہم گوشوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

1.2 وجہی کی حیات

1.2.0 وجہی کا نام

وجہی کا نام اسد اللہ تھا۔ اس نے ضرورت شعری کے لیے ایک سے زائد تخلص استعمال کیے ہیں۔ کہیں اس نے وجہیا، وجہ، وجیہہ استعمال کیا ہے تو کہیں وجیہی اور وجہی استعمال کیا ہے۔ وجہی کا ہمعصر غواصی اسے وجیہی لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے اس دکن کے شاعروں میں

تجھ شہنشاہ کے نزدیک غواصی اور وجیہی شاعر حاضر جواب۔

1.2.1 سنہ اور جائے پیدائش

وجہی کی سنہ پیدائش کے سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کے حالات زندگی پر اس کے عہد کی تاریخیں یا بعد میں لکھے تذکروں یا ادبی تواریخ سے زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ وجہی کی حیات کی طرف اشارے خود اس نے اپنے فارسی دیوان میں کیے ہیں۔ بہت سی گتھیاں اس کے فارسی دیوان کے دریافت کے بعد ہی حل ہوسکی ہیں، مختلف محققین نے اپنے اپنے طور پر وجہی کا سنہ ولادت، متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب اس بات پر متفق نظر آتے ہین کہ وجہی نے چار بادشاہوں یعنی ابراھیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا اور طویل عمر پائی۔ ڈاکٹر زور 1558 یا 1555 کو وجہی کا سنہ پیدائش قرار دیتے ہیں، تو نصیرالدین ہاشمی 966ء کو۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر کے خیال میں 974 یا 975ھ (1567 یا 1568ء) کے زمانے کو وجہی کی پیدائش کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے، سب محققین نے قطب مشتری کو بنیاد بنا کر وجہی کی پیدائش کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے قطب مشتری 1018ھ 1609ء میں لکھی گئی۔ اس کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا لکھنے والا فکری اور ذہنی اعتبار سے بالغ النظر ہے۔ اس مثنوی کے آخری باب میں اس نے جس بے باکی کی ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی سہاگ رات کے واقعات نظم کیے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی جرائت نہ ہی کوئی کم عمر شاعر کرسکتا ہے اور نہ ہی کوئی معمر شاعر۔ ایسا وہی شخص کرسکتا ہے جو بادشاہ وقت کا محرم راز ہو جو اس سے بڑی حد تک بے تکلف ہو اور اس کا ہم عمر ہو۔ محمد قلی قطب 973ھ (1565ء) میں پیدا ہوا تھا۔ وجہی کی پیدائش کا زمانہ کم وبیش یہی ہوسکتا ہے۔ وجہی محمد ابراھیم قطب شاہ کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس کا آبائی وطن خراسان ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے،

؎ من زہند آشکار گشتم لیک ☆ طبع پاک من از خراسان است

وجہی نے قطب مشتری میں دکن اور تلنگانہ کی بڑی تعریف کی ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہی علاقہ اس کی جائے پیدائش ہو۔ قطب مشتری میں دکن کی تعریف بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینا، انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کو حرمت نگینا ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے　　کہ سب ملک سر، ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بھوتیچ خاصا ہے　　تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

1.2.2 وجہی کا مطالعہ:

وجہی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سب رس کے مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے علوم السلامیہ، احادیثِ نبوی، قرآنی علوم اور تصوف کی خاص طور پر تعلیم دی گئی تھی۔ عربی، فارسی اور دکن زبان میں اس نے مہارت حاصل تھی۔ اسے محاورہ اہل ہند، گوالیار کے فہمیوں کی زبان، زبان ہندوستان، ہندی زبان اور محاورہ اہل دکن اور مقامی زبانوں پر عبور تھا۔ یہی بات ہے کہ سب رس میں مقامی بولیوں کے مروجہ الفاظ، دکنی روزمرہ اور ضرب الامثال کا استعمال بڑی اچھی طرح کرتا ہے۔ ہندو دیومالا سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔ ہندوستان کی ادبی روایات پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ حافظ شیرازی خاقانی، امیر خسرو، عرفی کے کلام کا اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا، اوران سے اثر قبول کیا تھا۔ اس نے مختلف موقعوں پر ان اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

خیالات کمال و ناز کی ہا حسن ہنداست　　کہ سوز خسرو الفاظ حافظ در سخن دارم
پختگی ہائے شعر خاقانی ست　　در سخن ہائے نیم خام وجیہہ

مطالع کی وسعت اور مختلف زبانوں پر عبور بی وہ سے وجہی کو اپنے معاصرین میں ممتاز مقام حاصل تھا۔

1.2.3 محمد قلی قطب شاہ کا عہد:

محمد قلی قطب شاہ 988ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دور اپنی ادبی سرگرمیوں، علمی کاوشوں اور تخلیقی

اور تہذیبی کارناموں کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت کا زریں دور ہے، بقول پروفیسر عبدالمجید صدیقی:

"محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت جو کم وبیش تینتیس ۳۳ پر محیط ہے ارتقائے تمدن کا زرّین باب ہے، اس عہد میں قطب شاہوں کا بڑا تمدن پیدا ہوا، جس پر آندھرا پردیش، ہمیشہ فخر کرتا ہے۔"

(تاریخ گولکنڈہ ۱۴۹)

محمد قلی قطب شاہ کو ورثے میں نہ صرف ایک مستحکم اور طاقت ور حکومت ملی تھی بلکہ تہذیبی، علمی اور ادبی روایات بھی ملی تھیں۔ اس کے عہد میں امن وامان کا دور دورہ تھا اسے فنون لطیفہ، شعروادب تہذیب وتعمیر کاموں میں خوب قدر افزائی کی۔ وہ ایک رعایا پرور حکمران تھا، حیدرآباد جیسے خوشنما شہر کا بانی، دکنی تلنگی اور فارسی کا شاعر اور سرپرست تھا۔ اس نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس کی مملکت میں نشونما پائیں۔ اس نے عیدالفطر، بقرعید، محرم، بسنت، وغیرہ کو ایسے تہوار بنادیا جو قوم کی اجتماعی مسرت وبہجت کی روح کے آئینہ دار بن گئے اس نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں مذہبی، درباری، اور عوامی زندگی کے علاوہ محلات کی رنگینیاں، وصل کے رنگ رلیاں، اور سماجی تقریبات کی ہنگامہ خیزیاں، مطربان خوش نوا کے جاں افروز نغمے غرض تمام چیزیں شامل ہیں۔ ایک طرف وہ مذہب کی طرف مائل ہے، تو دوسری طرف عشق ومحبت کا دلدادہ ہے۔ دوشیزاؤں کے جمال کا شیدائی ہے۔ حسن کا پرستار ہے۔ مہ جبینوں کی دلربائیوں کا پرستار ہے۔ ان کے عشوہ وناز وادا پر فریفتہ ہے۔ وہ ہر شے کے جمالیاتی پہلو سے لطف اندوز ہوتا ہے، وہ فطرتاً عاشق مزاج ہے۔ اس کی زندگی رومان پرور فضا میں گزری، اس کے دور میں شہر حیدرآباد کی بنیاد پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر صفہانِ اور خراسان کا ہم پلہ ہوگیا، ان دونوں شہروں کی طرح یہاں بھی دین ودنیا، تصوف اور تعیش کے دو دھارے یکساں چلتے نظر آرہے تھے، وجہی کے بیان ان دونوں دھاروں کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے لیے یہ ماحول بڑا سازگار آیا۔ محمد قلی کا عہد وجہی کی زندگی کا شاندار عہد رہا۔ اسی زمانے میں اسے شاہی تقرب میسر آیا اور وہ ملک الشعرا بن گیا، جاوید وششٹ کا خیال ہے۔

"یقیناً اس زمانے میں جو اس کو عہد شباب تھا اسے راحت اور رفراغت کے تمام اسباب میسر ہوں گے۔ بادشاہ وقت کی طرح وہ ایک رنگین مزاج اور عیش پسند شاعر تھا، اس زمانے میں اس کی زندگی کی تمام

ترشراب، شاہد وشعر، سے عبارت تھی، جس کی جانب اس نے اپنے فارسی اشعار میں بلیغ اشارے کیے ہیں"
(قصہ حسن ودل ۴۱)

وجہی نے 1609ء میں قطب مشتری لکھی، جس میں محمد قلی قطب شاہ اور بھگ متی کی فرضی عشقیہ داستان کوموضوع بنایا گیا ہے۔ اس مثنوی کو نہ صرف مثنوی کی بلکہ ادب کی تاریخ میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس کے مطالع سے وجہی کے کمالِ فن اور قدرت زبان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔وجہی کہتا ہے اس نے اس مثنوی کو بارہ دن میں مکمل کیا ہے،

تمام اس کیا ویس بارا منے　　سنہ ایک ہزار ہوا اٹھارا منے (1018ھ)

1.2.4 محمد قطب شاہ کا عہد

محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد محمد قطب شاہ 1020ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ان روایتوں کو جاری رکھا جن کی بنیاد ابراھیم قطب شاہ کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ محمد قطب شاہ اپنے علم وفضل، پاکیزہ ذوق اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے بے حد مشہور تھا۔ اس کا عہد قطب شاہی عہد حکومت کا نقطہ عروج تھا۔ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اس نے ملک میں شرعی احکام نافذ کیے تھا۔شراب خانے بند کروادیے۔قلی کے عہد کی رنگ رلیاں طاق نسیاں ہوگئیں، اس کے عہد میں وجہی کو بڑے مشکلات کا سامنا کرتا پڑا۔ وہ عشرت میں اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔ دربار سے تعلق ختم ہوگیا۔ عیش و مسرت کے دن رخصت ہوگئے۔ وہ عیش وعشرت کا عادی ہو چکا تھا۔ تنگ دستی کی وجہ سے اس کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔ تقریباً پندرہ برس بڑی ہی اذیت میں گذارے اس نے وظیفہ کی بحالی کی کوشش ضرور کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ ایک شعر میں کہا ہے؛

ے زشاہ گنج بخش اے دل مزار جز رنج حاصل نیست　　چہ خواہم داشت زیں طالع امید سرفرازی ہا

اس معقولی کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ کسی خدا ترس نے جس کے دل میں شروع سے ہی بغض تھا موقع پاکر بادشاہ کو وجہی کے خلاف بھڑکا دیا۔ اور اس کی نیک نامی کو نقصان پہنچا دیا۔

عبث، از من جدا کردہ است، دشمن بادشاہم را

گنہ از ادست گوناحق بہ شہہ گفت ایں گناہمرا

از اول، ایں خدا ناترس، گویا بُغض در دل داشت

بہ بدنامی من آورد آخر نیک خواہم را

سختی حالات سے تنگ آکر وہ شاعری کے ساتھ ساتھ ترک وطن بھی کرنا چاہتا تھا۔

وجیہی با چنیں فضل و ہنر بے سیم و زر نشیں

بہ اقلیم دگر رو، خیز، تا کے در دکن باشی

وہ کنج عزلت میں پناہ لیتا ہے۔ یہ کہہ کر خود کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے کہ

فقیرم، کنج تنہائی خوش آمد

ہوا لے خدمتِ سلطان نہ دارم

گر وجیہی خدمت سلطان نہ کرو ایں راچہ غم

لاابالی را نظر بر اوج عزّ و جاہ نیست

اپنی خودداری اور عزّت نفس کا سودا نہیں کرتا۔ مایوسیوں اور پریشانیوں میں بھی اپنی آبرو کو بچانے رکھنے کے جتن کرتا ہے۔ اسے اپنے فن پر اعتماد ہے، شاعری ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے۔ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہتا ہے

در ماندہ نگشتیم بہر شہر کہ رفتیم　　　در سینۂ خود گنج ہنر داشتہ بودیم

امید کہ تمام دروازے بند ہو جانے کے بعد وہ مفلسی میں، اپنی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے تصوف اور مذہب کا دامن تھام لیتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں اسے تلخ تر حالات میں بھی اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔

1.2.5 عبداللہ قطب شاہ کا عہد

1035ھ م1625ء میں عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے اتھ ہی وجہی کے دن پھر گئے۔ اسے عبداللہ کے دربار میں باریابی نصیب ہوئی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس عہد میں وہ تمام پابندیاں ختم ہوگئیں جو محمد قطب شاہ کے زمانے میں وجہی پر عائد کردی گئیں تھیں۔ عبداللہ قطب شاہ عیش پسند بادشاہ تھا، طرب ونشاط کا دلدادہ تھا کبھی سات گھاٹ کے پر فضا باغون میں دادعیش دیتا تو کبھی کوہ طور کی عشرت گاہیں اور محلات اسکی بزم طرب بنے۔ اس نئے دور کا وجہی بڑی خوش دلی سے خیر مقدم کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ بادشاہ نو کے لطف وکرم سے وہ دولت مند بن گیا ہے۔ گدائی اور گوشہ نشینی کی زندگی ترک کردی ہے۔

تشنیدہ وجیہ گدائی گزاشتیم ا+ گشتم تو نگراز کرم بادشاہ نو

عبداللہ قطب شاہ وجہی کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ وجہی کے ادبی مرتبے اور اسکی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں سے واقف تھا۔ یہی وجہ ے کہ وہ نہ صرف وجہی کا منصب بحال کرتا ہے بلکہ دربار میں بلاتا ہے۔ اسے 'پان " سے نوازتا ہے۔ اور ایک کتاب لکھنے کی خصوصی فرمائش کرتا ہے۔ وجہی کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس واقعہ کا ذکر وہ سب رس کے دیباچے میں اس طرح کرتا ہے۔

سلطان عبداللہ، ظل اللہ، علام پناہ، حقیقت آگاہ، دشمن پر در ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر۔۔۔ صباح کے وقت بیٹھے تخت، یکا یک غیب تے کچہ رمز پا کر ودل میں اپنے کچہ لیا کر وجہی نادر من کوں، دریا دل گوہر سخن کوں، حضور بلائے پان دیے بہوت مان دیے، ہور فرمائے کہ انسان کے وجود بیچ میں کچھ عشق کا بیان کرتا اپنا ناوَل عیاں کرنا، کچھ نشان دھرنا'۔

وجہی کو ایک زریں موقع ہاتھ آیا اس نے اس کتاب میں اپنا زور قلم صرف کردیا، ایک خشک موضوع کو اپنے اسلوب بیان سے اس نے یادگار بنادیا۔ سب رس کا سنہ تصنیف 1045ھ م1635ہے۔

1.2.6 وفات:

وجہی کے سنہ وفات کے متعلق بھی قطعیت کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا، جس طرح وجہی کے سنہ پیدائش کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے اسی طرح، قیاس کیا جاسکتا ہے کہ 1076ھ

اور 1665ء کے درمیاں وفات پائی ہوگی۔ پھولبن میں جس کا سنہ تصنیف 1076ھ ہے ابن نشاطی ان تمام اساتذہ کا ذکر کیا ہے جو اس وقت تک انتقال کر چکے تھے۔ اس نے محمود فیروز شیخ احمد کا ذکر کیا۔ اگر وجہی فوت ہو گیا ہوتا تو اس کا ذکر بھی وہ یقیناً کرتا اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وجہی 1076 تک بقید حیات تھا، البتہ وہ 1082 انتقال کر چکا تھا۔ اس لئے کہ طبعی نے اپنی مثنوی بہرام وگل اندام (سنہ تصنیف 1083ء) میں وجہی کے خواب میں آنے کا ذکر کیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں موجود سب رس کے ایک مخطوطے کے ترقیمے میں درج ہے کہ وجہی حضرت شاہ کی درگاہ میں دفن کیا گیا ہے۔ یہ مخطوطہ 1196ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے کاتب غلام حسین غلام ولد میر محمد غوث بخاری ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ نمونہ جوابات

سوال ۱: وجہی کا نام کیا تھا، اور اس کے مختلف تخلص کون سے تھے۔

سوال ۲: قطب مشتری کا موضوع کیا ہے۔

جواب ۱ اور ۲: ان سوالوں کے جوب 1.2.1 اور 1.2.3 کے تحت دیکھئے۔

1.2.7 وجہی کے عقاید

وجہی ایک راسخ العقیدہ شیعہ تھا۔ اس نے کئی اشعار میں شیعہ عقائد کا اظہار کیا ہے۔ بقول خان رشید ملا وجہی شیعہ مسلک تھا۔ قطب مشتری میں اس کے بے شمار شواہد جوجود ہیں۔ نعت کے 26 اشعار ہیں اس کے مقابلے میں منقبت تقریباً پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ اگر ذکر معراج کے اشعار بھی نعت، میں شامل کر لئے جائیں تو ان کی تعداد ۶۰ ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذکر معراج میں حضرت علی کی فضیلت و بزرگی کے لیے گیا گیا ہے، تین مثنویاں 94

وجہی نے سوائے حضرت علی کے خلفائے راشدین میں کسی کا ذکر نہیں کیا، حتیٰ کہ ذکر معراج کے باب میں وہ یہ کہنے سے باز نہیں آتا کہ

محمد کو جس رات معراج ہوئی　　نہ تھا دوسرا واں علی باج کوئی

حضرت علی کی منقبت میں کہتا ہے کہ:

خبر سب اہے نیک ہور بد کی تج　　سہاتی ہے جا گا محمد کی تج

ایک جگہ یہ بھی کہتا ہے کہ علی کا مقام خلافت سے کہیں اونچا ہے اور مسند خلافت پر ان کا بیٹھنا باعث عار تھا۔

خلافت نے اونچا تر اٹھار تھا۔　　خلافت تجے بینا عار تھا

اسی منقبت میں وہ کہتا ہے

علی کا محبّ نئیں جو کوئی سچ تو جان　　حرامی پنے کا وہی ہے نشان

سب رس کے دیباچے میں وہ کہتا ہے

"اول خدا ہے نبی دریم سویم ہے ولی، یو تین نانوں تھے، مومن کے دل کو تجلی، محمد کوں جس رات ہوی معراج وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج"

1.2.8　وجہی کی تصانیف:

مثنوی قطب مشتری میں یہ مثنوی دکنی مثنویوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ دکنی کی پہلی طبعزاد عشقیہ مثنوی ہے، اس کا سنہ تصنیف ۱۰۱۸ھ 1635 ہے۔ اس کا موضوع قلی اور بھاگ متی کی داستان عشق ہے، مگر اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اس نے بھاگ متی کو مشتری کا نام دیدیا ہے، اسی مناسبت سے مثنوی کا نام قطب مشتری رکھا ہے، اس میں "در شرح شیر گوید" کے تحت جو شعر کہے ہیں ان میں شعر کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے اس کے تنقیدی شعور اور فنی بصیرت کا پتا چلتا ہے، اس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج کے تنقیدی نظریات سے بڑی حد تک میل کھاتے ہیں۔

ماۃ سیما در پری رخ: گارسان رتاسی نے وجہی کی اس مثنوی کا ذکر اپنے خطبات میں کیا ہے۔ پروفیسر ضامن علی نے جائزہ زبان اردو میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ محمد حفیظ الہ آباد کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ تاہم اس بات کی اب تک توثیق نہیں ہو سکی ہے۔

دیوانِ وجیہ فارسی: وجہی فارسی کا زبردست شاعر ہے۔ اس دیوان کے مطالعے سے اس کی زندگی کی کئی گمشدہ کڑیاں مل سکتی ہیں۔ اس میں 3900 ابیات ہیں۔

تاج الحقائق: اکٹر نور السعید اختر نے اسے مرتب کر کے شائع کیا ہے وہ اسے وجہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں بعض ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ یہ وجہی کی نہیں شاہ وجیہ الدین (910-998)ھ کی تصنیف ہے۔

سب رس: وجہی کی شاہکار تصنیف ہے یہ 1045ھ م 1635ء میں عبداللہ قطب شاہ کے ایما پر لکھی۔ اس میں اس نے عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

1.3 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ وجہی کے سنہ پیدائش اور مقام پیدائش کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھئے

۲: وجہی کی تصانیف کا تعارف کروائیے۔

۳: محمد قطب شاہ کے عہد میں وجہی کی زندگی کس طرح بسر ہوئی۔

۴: وجہی کی حیات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیجئے۔

1.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو وجہی کی سوانح حیات سے واقف کروایا ہے۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی میں معلومات حاصل کی ہیں۔ اس میں ہم نے وجہی کے نام، تخلص، قطب شاہوں کے دربار سے اس کی وابستگی اس کے سنہ ولادت اور وفات سے واقفیت حاصل کی۔ اور اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

1.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
قطعیت	یقین کے ساتھ	تعیّشات	تعیش کی جمع
گتھی	گرہ، الجھن		سامانِ عیش، نشاط
مستحکم	مضبوط	معاصر	ہم زمانہ
محرم راز	رازدار	راسخ العقیدہ	مضبوط عقیدہ والا

1.6 سفارشی کتب

۱۔اردو کی تین مثنویاں	خان رشید
۲۔اردو نثر کا آغاز وارتقا	پروفیسر رفیعہ سلطانہ
۳۔تاج الحقائق	مرتبہ: ڈاکٹر نور السعید اختر
۴۔دکنی مثنویوں کا انتخاب	ڈاکٹر اشرف رفیع
۵۔تاریخ دکن	پروفیسر عبدالمجید صدیقی
۶۔دکن میں اردو	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۷۔حیات وجہی	ڈاکٹر م۔ن۔سعید
۸۔سب رس کی تنقیدی تدوین	ڈاکٹر حمیرہ جلیلی
۹۔سب رس کا قصہ حسن ودل	جاوید وششٹ
۱۰۔سب رس پر ایک نظر	سہیل بخاری

ڈاکٹر۔یس مسعود سراج،

پروفیسر وچیرمین

شعبہء اُردو، میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۲) سب رس کا قصہ:

ساخت:

2.0 اغراض ومقاصد

2.1 تمہید

2.2 سب رس کا قصہ

2.2.1 آب حیات کی تاویل

2.2.2 نظر، شہر سبکسار، اور شہر دیدار میں

2.2.3 نظر حسن کے دربار میں

2.2.4 نظر اور خیال شہر تن میں

2.2.5 دل، شہر دیدار کی جانب

2.2.6 حسن و دل کی ملاقات

2.2.7 حسن و دل کی شادی

2.3 نمونہ امتحانی سوالات

2.4 خلاصہ

2.5 فرہنگ

2.6 سفارشی کتابیں

2.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ سب رس کا قصہ پیش کر سکیں۔

☆ قصہ کے کردار جان سکیں۔

☆ قصہ کی تھیم اور مقصد کو سمجھ سکیں ۔

2.1 تمہید: اس اکائی میں سب رس کے قصے کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ داستان ہے اس کا ہیرو دل ہے اور ہیروئن حسن ہے۔ اس میں یہ بھی معلوم کرایا گیا ہے کہ دل آب حیات کا ذکر سن کر اسے پانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کا پتہ لگانے کے لیے اپنے ایک جاسوس نظر کو روانہ کرتا ہے۔ نظر آب حیات کی تلاش میں حسن کے دربار تک پہنچتا ہے۔ حسن کے پاس موجود ہیرے پر ترشی ہوئی مورت کو دیکھکر کہتا ہے یہ دل کی تصویر ہے۔ دل کی تعریف اس انداز سے کرتا ہے کہ حسن اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ درمیاں میں کئی معرکے ہوتے ہیں۔ آخر میں حسن و دل کی شادی ہو جاتی ہے۔

2.2 سب رس کا قصہ:

عقل اور عشق دو بادشاہ ہیں۔ عقل مغرب کا بادشاہ ہے اور عشق مشرق کا بادشاہ ہے۔ عقل ملک سیستاں مین رہتا ہے اس کا ایک بیٹا ہے جس نام دل ہے۔ وہ حسن صورت اور حسن سیرت میں بے مثال ہے عشق کی ایک بیٹی ہے وہ بری حسین و جمیل ہے اس کا نام حسن ہے۔

2.3 آب حیات کی تاویل:

دل جب بڑا ہوا تو عقل نے اسے شہر تن کی بادشاہت عطا کر دی ایک دن دل نے کسی قصہ خواں سے آب حیات کا قصہ سنا دل کو آب حیات حاصل کرنے کا ایسا اشتیاق پیدا ہوا کہ اس پر کھانا پینا حرام ہو گیا۔ دل کا یہ اشتیاق دیکھ کر اس کا جاسوس "نظر" آب حیات کی تلاش میں روانہ ہوا۔ آخر چلتے چلتے شہر عافیت میں پہنچا۔ اس کے بادشاہ "ناموس" سے آب حیات کے بارے میں دریافت کیا "ناموس" نے کہا کہ آب حیات ایک تمثیل ہے۔ ہر شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اصل آب حیات انسان کی آبرو

ہے۔ نظر مانوس کی باتیں سن کر بہت مایوس ہوا، اسے سلام کر کے آبِ حیات کی تلاش میں آگے بڑھا۔

نظر کو راستے میں ایک پہاڑی نظر آئی جو اصل میں ایک زرق نامی بوڑھے زاہد کا شکن تھا۔ زرق، نظر کو بتاتا ہے کہ آبِ حیات کو عاشق کے آنسوؤں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ نظر کو زرق کی باتوں سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ آگے بڑھا، نظر کو راستے میں ایک "ہدایت" نامی ایک قلعہ نظر آیا۔ اس کا بادشاہ "ہمت" تھا۔ ہمت نظر کو اپنے ارادوں میں ثابت قدم دیکھ کر کہا کہ مشرق میں ایک اولوالعزم بادشاہ 'عشق' ہے اس کی بیٹی کا نام حسن ہے۔ ناز، غمزہ، ادا، دلربائی، خوشحالی اور لطافت اس کی سہیلیاں ہیں۔ اس کی ولدیت میں کوہِ قاف کی دوسری جانب ایک شہر جس کا نام "شہر دیدار ہے اس میں ایک باغ ہے جس کا نام 'رخسار" ہے اس میں ایک چشمہ جو "دہن" ہے۔ اس چشمے میں "آبِ حیات' ہے، جس کی تجھے تلاش ہے۔ یہ کہہ کر ہمت نے ایک سفارشی خط اپنے بھائی "قامت" کے نام دیا اور بتایا کہ شہر دیدار تک رسائی بہت مشکل ہے کیونکہ راستے میں ایک شہر ملے گا جس کا نام "سبکسار"، اس کا حاکم ایک دیو 'رقیب" ہے۔

2.2.2 نظر شہر سبکسار اور دیدار میں:

جب نظر "سبکسار" میں داخل ہوا تو اسے گرفتار کرلیا گیا، اور رقیب کے سامنے حاضر کیا گیا۔ نظر اپنی جان کو خطرہ میں پایا تو بتایا کہ میں ایک کیمیا گر اور حکیم ہوں۔ مٹی کو سونا بناتا ہوں۔ رقیب بڑا حریص تھا۔ اس نے اس سے سونا بنانے کی فرمائش کی۔ نظر نے کہا کہ سونا بنانے کے لیے دواؤں کی ضرورت ہے جو "باغ رخسار" میں مل سکتی ہیں۔ رقیب اسے شہر دیدار لے گیا، یہاں نظر کی ملاقات قامت سے ہوگئی۔ اس نے ہمت کا خط اسے دے دیا، قامت معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اور نظر کو کہیں چھپا دیا۔ اس طرح نظر نے رقیب کے پنجے سے رہائی پائی۔ رقیب نظر کی بہت کچھ تلاش کی، پھر مایوس ہوکر واپس ہوگیا۔ نظر نے قامت کے ہمراہ شہر دیدار کی سیر کی، یہاں اس کی ملاقات حسن کی سہیلی "لٹ" سے ہوگئی، لٹ نے نظر سے سارا حال سنا، اور اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا، اسے اپنے چند بال

دیے اور کہا کہ وقت مصیبت ان بالوں کو آگ پر جلانا میں مدد کے لئے پہنچ جاؤں گی۔

یہاں نظر نے "شہزادئی" حسن کو دیکھا، غمزہ نے اسے غیر شخص سمجھ کر پکڑ لیا اور اسے مار ڈالنا چاہا، اتنے میں اسے نظر کہ بازوؤں پر لعل نظر آیا، تو اس نے فوراً اپنے بھائی کو پہچان لیا۔ اس کی ماں نے بچپن میں بطور نشانی دونوں بیٹیوں نظر اور غمزہ کے بازوؤں پر ایک ایک لعل باندھ دیا تھا۔ دونوں بھائی خوش ہو کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے پھر غمزہ اپنے بھائی نظر کو گھر لے آیا۔

2.2.3 نظر حسن کے دربار میں:

دوسرے دن غمزہ نے نظر کو شہزادی 'حسن" کی خدمت میں پیش کیا۔ اور بتایا کہ یہ بڑا جوہری ہے۔ حسن یہ سن کر بہت مسرور ہوئی، اور اسے پرکھنے کے لئے ایک ہیرا دیا، جوں ہی "نظر" کی نظر ہیرے پر بنی ہوئی خوبصورت مومنی مورت پر پڑی تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو دل کی تصویر ہے، اس نے دل کی تعریف اس انداز سے کی کہ شہزادی حسن اس پر عاشق ہو گئی، اور نظر سے کہنے لگی کہ وہ اس کی ملاقات دل سے ضرور کروادے۔ نظر نے کہا کہ دل کو آب حیات کی تلاش ہے اور اگر آب حیات کا پتہ مل جائے تو میں دل کو آپ سے ملا سکتا ہوں، اس بات پر شہزادی آمادہ ہو گئی۔ اپنے ایک غلام 'خیال" کو اس کے ساتھ روانہ کیا۔ اور ایک انگوٹھی بھی نظر کو دی۔ کہ یہ انگوٹھی وہ دل کو دکھائے اور اسے یقین دلائے کہ شہزادی حسن آب حیات کا چشمہ تک پہنچا ہی سکتی ہے۔ اس انگوٹھی کی خوبی یہ تھی کہ جو کوئی اسے منہ میں رکھ لے وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

2.2.4 نظر اور خیال شہر تن میں:

نظر اور خیال دونوں شہر تن کو پہنچے، اور دل سے ملاقات کی نظر نے سفر کا حال سنایا اور خیال جو مصور بھی تھا اس نے حسن کی تصویر کھینچکر دل کو دکھادی۔ دل بھی حسن پر فریفتہ ہو گیا اور شہر دیدار جانے کا ارادہ کر لیا، دل کی یہ حالت دیکھ کر اسکا ایک وزیر "وہم" نے اس کی اطلاع بادشاہ عقل کو دی۔ بادشاہ

کے دل میں یہ شک ڈال دیا کہ اگر دل شہر دیدار جائیگا تو بڑا فتنہ پیدا ہوگا۔ اور مشکلیں پیدا ہو جائیں گے، "وہم" کی باتوں میں آکر عقل نے اپنے فرزند 'دل" اور جاسوس "نظر" کو قید کر دیا۔ نظر حسن کی دی ہوئی انگوٹھی کی مدد لے کے نظر قید سے باہر نکل آیا، اور شہر دیدار پہنچا۔ جس وقت وہ رخسار کے باغ کی سیر کر رہا تھا، کہ اسے آب حیات کا چشمہ نظر آ گیا۔ اس نے چاہا کہ آب حیات پی لے، جیسے ہی وہ منھ کھولا انگوٹھی پانی میں گر پڑی۔ اور آب حیات کا چشمہ نظر سے غائب ہو گیا، اور رقیب کی نظر میں "نظر" آ گیا۔ رقیب نے اسے قید کر دیا، نظر کو اس وقت "لٹ" کی یاد آ گئی، جس نے سے کچھ بال دیے تھے، نظر نے بال جلائے تو "لٹ" حاضر ہوگئی، اور اسے قید سے رہائی دلوائی۔ نظر نے شہر دیدار پہنچ کر ساری روداد شہزادی حسن کو سنایا، حسن دل سے ملنے بے تاب و بیقرار ہوگئی، اپنے ایک خادم، "عمزہ" کو نظر کے ہمراہ روانہ کیا، تا کہ وہ دل کو قید سے چھڑا لائے۔

2.2.5. دل شہر دیدار کی جانب

ادھر عقل بادشاہ نے نظر کے فرار ہونے کی خبر تمام سرحدی حکام کو اس ہدایت کے ساتھ بھیج دی کہ جہاں کہیں نظر ملے اسے قید کر لیا جائے۔ یہ اطلاع ملتے ہی زرق کا بیٹا "توبہ" اپنا لشکر لیکر نظر اور غمزہ پر حملہ کر دیا، لیکن اسے شکست ہوئی اس کی فوج درہم برہم ہوگئی۔ اس نے بادشاہ کو جا کر اپنی شکست اور غمزہ کی سفا کی کی خبریں سنائیں۔ تو عقل بادشاہ نے دل کو رہا کیا اور کہا کہ تم حسن کے پاس جانا چاہتے ہو تو جاؤ مگر اکیلے نہ جاؤ، بلکہ لشکر ساتھ لے جاؤ، دل آمادہ ہو گیا اور لشکر کے ہمراہ روانہ ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

ا: ناموس اور زرق آب حیات کی کیا تاویل کرتے ہیں؟

۲: نظر کو حسن کے دربار میں کون پہنچاتا ہے؟

ا: اور جواب ۲ ان سوالوں کے جواب 2.2.1 اور 2.2.2 اور 2.2.3 میں دیکھئے۔

دل جب لشکر کے ساتھ جنگل پہنچا تو وہاں اسکو بہت سی ہرنیاں نظر آئیں جو اصل میں غمزہ کے سپاہی تھے۔ دل نے ان کا پیچھا کیا اور جنگ میں پریشان پھرنے لگا۔ اس کی خبر جب عقل کو ہوئی تو وہ دل کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج لیکر روانہ ہوا۔ عقل اور دل دونوں شہر دیدار پہنچے۔ حسن کو جب اس لشکر کی آمد کا علم ہوا تو اس نے اپنے باپ عشق کو آگاہ کیا کہ عقل اور دل شہر دیدار پر حملہ کرنے کے لیے آئے ہیں، عشق نے ایک لشکر اپنے سپہ سالار "مہر کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ پہلے دن "غمزہ" "عقل" کے مقابل ہوا۔ دوسرے دن "قامت" اور تیسرے دن "لٹ" عقل کے لشکر پر ٹوٹ پڑی۔ چوتھے دن بھی جنگ جاری رہی، تب حسن نے اپنے خادم "خال" کے مشورے سے اپنی مدد کے لیے کوہ قاف سے اپنی "ہمزاد" کو طلب کیا۔ حسن نے اپنے سپہ سالار "ہلاک" کو اس کی کمک پر روانہ کیا۔ عقل کی فوج درہم برہم ہوگئی۔ اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ دل پر بھی تیر لگا۔ مگر ہلاک اس کو میدان سے باہر نکال لایا، اور شہر دیدار میں اس کو پناہ دی۔

2.2.6 حسن و دل کی ملاقات:

اس فتح پر حسن بہت خوش ہوئی۔ حسن کے حکم سے عقل کو گرفتار کیا۔ اور دل کو چاہ ذقن میں قید کر دیا، جہاں آب حیات کا چشمہ تھا۔ دل کو چاہ ذقن سے حسن کی سہیلی "زلف" نے نکالا۔ اور "باغ دلکش" میں لے آئی وہیں حسن کی سہیلی "وفا" بھی تھی جب دل "باغ دلکش" میں پہنچا تو اس کو وہاں نیند آگئی۔ یہاں حسن بھی پہنچ گئی، فرط مسرت سے حسن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے، اور دل کے رخسار پر گرنے لگے دل جاگ اٹھا۔ حسن اور دل دونوں بغلگیر ہوگئے اس کے بعد دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

رقیب کی ایک بیٹی "غیر" تھی۔ جو حسن کی سہیلی تھی۔ جب اسے دونوں کی محبت کا راز معلوم ہوگیا تو اسکے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایک روز حسن کسی کام سے شہر کو گئی تھی۔ "غیر" کو موقعہ مل گیا۔ اس نے جادو کے زور سے حسن کی صورت اختیار کر لی۔ وصال کے چھجے پر دل سے وصل حاصل کیا۔ جب اس بات کا علم حسن کو ہوا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے "غیر" کو اپنے محل سے نکال

دیا۔ اور دل کو "غضب" کے قید خانے میں قید کر دیا۔ جب غیر نے سارے واقعات اپنے باپ کو بتائے تو وہ بہت برہم ہوا۔ اس نے دل کو "ہجراں" کے قید خانے میں ڈال دیا۔ جب دل کی حالت غیر ہوگئی تو اس نے حسن کو ساری حقیقت سنادی۔ حسن نے غیر اور دل کی خطائیں معاف کر دیں۔

2.2.7 حسن و دل کی شادی:

عقل شکست کھا کر شہر تن واپس آ گیا۔ جب ہمت کو عقل کی شکست کا علم ہوا تو وہ بڑا پریشاں ہوا۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا اور عشق سے جنگ کرنے کی غرض سے بھاری لشکر لے کر شہر دیدار کی جانب روانہ ہوا۔ طویل مسافت طے کر کے قامت کے باغ میں پہنچا۔ قامت کے ذریعے ہمت کو معلوم ہوا کہ دل ہجراں کے قید خانے میں قید ہے۔ قامت نے مشورہ دیا کہ عشق طاقت ور ہے اس سے صلح کرنا مفید ہوگا۔ ہمت عشق کے دربار میں حاضر ہوا، اور ساری روداد سنائی اور عقل کی سفارش کی۔ عشق نے خوش ہو کر عقل کو "مہر" کے ذریعے بلایا اور اپنا وزیر بنالیا۔ دل کو رہا کروایا۔ رقیب کو اور اس کی بیٹی کو قید کر دیا۔ رقیب کو اور اس کی بیٹی کو قید کر دیا۔ آخر میں عشق و عقل نے مشورہ کر کے حسن اور دل کی شادی بہت دھوم دھام سے کر دی۔

ایک دن دل، ہمت اور نظر تینوں شراب میں مست گلشن رخسار پہنچے، تو انہوں نے چشمہ آبِ حیات دیکھا اور وہیں خضر علیہ السلام کا دیدار کیا۔ ہمت کے کہنے پر دل نے خضرؑ کی قدمبوسی کی۔ حضرت خضرؑ نے دعا دی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسرار معرفت سمجھا دیے۔ چنانچہ خضرؑ کے فیض سے دل اپنی مراد کو پہنچا، اس کے بہت سے عقلمند بیٹے ہوئے جن میں سب سے بڑا بیٹا یہ کتاب سب رس ہے۔

2.3 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ سب رس کے قصے کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

۲۔ سب رس کے اہم کرداروں کا تعارف کرائے

۳۔ دل کو آب حیات تک پہنچنے کے لئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

۴۔ نظر کے کردار پر روشنی ڈالئے۔

2.4 خلاصہ

اس اکائی میں سب رس کے قصے کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کس طرح دل آب حیات کا ذکر سن کر بے چین ہوتا ہے کہ اس کی تلاش میں نظر کو بھیجتا ہے۔ نظر آب حیات کی تلاش میں حسن کے دربار تک پہنچتا ہے، عقل اور عشق کے درمیان معرکے ہوتے ہیں۔ آخر میں حسن و دل کی شادی کر دی جاتی ہے۔ ایک دن دل، ہمت اور نظر گلشن رخسار پہنچے، وہاں چشمہ آبِ حیات کو دیکھا اور خضرؑ کا دیدار کیا۔ اس اکائی میں آپ سب رس کے مختلف کرداروں سے واقفیت حاصل کی۔ اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں، اور مشکل الفاظ کے معنی بھی۔ توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

2.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
فریفتہ	عاشق	قطعیت	یقین کے ساتھ
قصد	ارادہ	گتھی	گرہ، الجھن
سفاکی	ظلم	معاصر	ہم زمانہ
مبادا	خدا نہ کرے	مستحکم	مضبوط
سرکروگی	سرداری	تعیشات	تعیش کی جمع
کمک	مدد	محرم راز	راز دار

2.6 سفارشی کتابیں

ا۔ سب رس — مرتبہ مولوی عبد الحق

۲۔ سب رس کی تنقیدی تدوین — ڈاکٹر حمیرہ جلیلی

۳۔ سب رس پر ایک نظر — سہیل بخاری

از: ڈاکٹر مسعود سراجؔ — : پروفیسر و چیرمین، شعبہ اُردو، میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۳) سب رس کا تجزیہ:

ساخت:

3.0 اغراض ومقاصد

3.1 تمہید

3.2 سب رس کا تجزیہ

3.2.1 سبب تالیف کتاب وتاریخ تصنیف

3.2.2 موضوع

3.2.3 ماخذ

3.2.4 اسلوب

3.2.5 مقفیٰ عبارت

3.2.6 انشائیہ کی ابتدائی شکل

3.2.7 تمثیل

3.2.8 قصہ

3.2.9 آیات، احادیث، اشعار، اور دوہوں کا استعمال

3.2.10 سماجی زندگی

3.3 نمونہ امتحانی سوالات

3.4 خلاصہ

3.5 فرہنگ

3.6 سفارشی کتابیں

3.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ سب رس کے سبب تالیف، سنہ تصنیف، ماخذ، قصہ اور اسلوب سے واقفیت حاصل کر سکیں اور انہیں اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

3.1 تمہید:

اس اکائی میں سب رس کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ سب رس دکنی کی بہترین داستان بھی ہے تمثیل بھی، اس میں ہم آپ کو یہ بھی معلوم کرائیں گے کہ سب رس کی اہمیت قصہ کی بنا پر ہے ۔یا اسلوب کی بنا پر نیز مختلف ادیبوں نے سب رس کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔

3.2 سب رس کا تجزیہ:

سب رس وجہی کی ایک معرکہ آرا تصنیف ہے۔ دکنی میں ادبی نثر کا یہ پہلا نمونہ ہے، آپ یہ جانتے ہوں گے کہ سب رس سے پہلے بھی نثری تصانیف ملتی ہیں۔ لیکن وہ سب مذہبی نوعیت کی ہیں ان کی اہمیت تاریخی ہے۔ ادبی اختیار سے وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ ان میں وہ ادبی شان نہیں ہے، جو سب رس کا نمایاں وصف ہے۔

وجہی نے سب رس عبداللہ قطب شاہ کے ایما پر سنہ 1045ھ میں لکھی۔ وجہی کی حیات سے آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد وجہی قصر گمنامی میں زندگی بسر کرتا رہا۔ برسوں بعد اس کی زندگی میں ایک سنہرا موقع آیا تھا، جبکہ بادشاہ وقت نے خود اس سے بیانِ عشق میں کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی۔

3.2.1 سبب تالیف کتاب، تاریخ وتصنیف

سب رس لکھنے کا خیال وجہی کو کیوں آیا خود اس کے الفاظ میں سنیئے۔

صباح کے وقت ، بیٹھے تخت، یکا یک غیب تے کچھامز پاکر
دل میں اپنے کچھ لیا، وجہی نادر من کوں، دریا دل گوہر سخن کوں
حضور بلائے، پان دیے، بہوت مان دیے ہور فرمائے
کہ انسان کے وجودیچہ میں کچھ عشق کا بیان کرنا
اپنا ناؤں عیاں کرنا کچھ نشاں دھرنا وجہی
ہو گنا گن بھر یا تسلیم کر کرسر پر ہاتھ دھریا
بہت بڑا اندیشہا بہوت، بڑی فکر کریا، بلند ہمتی
کے بادل نے دانش کے میداں میں گفتاراں برسایا
پرچنتیانومی تقطیع بیتیا کہ آنگے کے آن ہارے
ہمیں بھی کچہ تھے سمجھیں بارے ہمارے گن کوں
دیکھے سو ہمناد یکھے، گنگا دیکھے سو جمنا دیکھے "

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ محمد قطب شاہ کے عہد میں وجہی مفلسی و تنگ دستی کا شکار رہا۔ اسے دربار میں دوبارہ رسائی عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد حاصل ہوئی۔ غواصی درباری، شاعر بن چکا تھا، تخت نشینی کے چھے سال بعد عبداللہ قطب شاہ کے گھر لڑکا تولد ہوا تو غواصی اور وجہی دونوں نے تاریخیں کہیں۔ غواصی نے نثری تاریخ "محفوظ باد" سے برآمد کی۔ وجہی نے "آفتاب از آفتاب آمد پدید"، یہ واقعہ 1041ھ کا ہے، وجہی کی تاریخ بہت اچھی تھی۔ غواصی کی تاریخ میں وہ معنوی خوبی نہیں تھی، وجہی کو غواصی کی صلاحتیں محمد قلی قطب شاہ کے عہد ہی سے پریشان کرنے لگی تھیں۔ اس نے غواصی پر قطب مشتری میں طنز کے تیر چلائے ہیں۔ محمد قلی کے رخصت ہوتے ہی اس کے عیش وطرب کے دن رخصت ہوگئے، وہ محمد قطب شاہ کے زمانے میں مالی اعتبار سے بڑا پریشان رہا۔ عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ آیا، اسے راحت نصیب ہوئی۔ تاریخ نکالنے میں اس نے کما ل فن کا اظہار کیا ہے۔ اب سب رس لکھنے کا یہ دوسرا موقع ہاتھ آ گیا، بادشاہ وقت کی فرمائش ہے، وہ اپنے

دشمنوں کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ حریفوں پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک ایسا کارنامہ اپنی یادگار چھوڑ جائے کہ آنے والی نسلیں بھی اسے یاد کریں، اور استاد تسلیم کریں۔ وجہی سب رس کے سنہ تصنیف سے متعلق کتاب کے آخر میں لکھتا ہے

بارے جس وقت (1045) تھا ایک ہزار چہل و پنج اس وقت ظہور پکڑیا یہ گنج:

3.2.2 موضوع

وجہی نے سب رس میں عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثالیہ قصہ، متصوفانہ معنویت، رنگین اسلوب نگارش نے اسے نہ صرف وجہی بلکہ دکنی ادب کی ایک بے مثل یادگار بنا دیا ہے۔ سب رس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عشق حقیقی کی بھی عمدہ تمثیل ہے اور عشق مجازی کی بھی۔ وجہی کا کمال یہ ہے کہ اس نے متصوفانہ قصے میں دنیا کی روزمرہ زندگی کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور فطرت انسانی کی نیرنگیوں کی بھی تصویر کشی کی ہے، اس نے اپنے ماحول کی عکاسی بھی کی اور اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ سب رس کو اپنے اسلوب کی وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے اس میں انشائیہ کی ابتدائی شکل ملتی ہے۔ نیز ناول کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ بقول عبدالحق:

"یہ کتاب ادبی نظر سے قدیم اردو میں خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ قصہ بھی عجیب ہے اور طرز بیان بھی عجیب مصنف نے ایک عالمگیر حقیقت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور حسن و عشق کی کشاکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ بڑے مزے کا قصہ ہے۔ کون ہے جو اس کوچے سے نا آشنا ہو اور جس نے اس معرکہ میں چوٹ نہ کھائی ہو"

3.2.3 ماخذ

سب رس میں وجہی نے کہیں اپنے قصے کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصہ اس کے اپنے ذہن کی اپج ہے۔ اس کا اپنا تخلیق کردہ ہے۔ وجہی کا یہ دعویٰ محض دعویٰ ہے۔ کیونکہ اس نے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی کی تصنیف، قصہ حسن و دل کا چربہ اڑایا ہے۔ فتاحی نے اس قصہ کو ایک مثنوی دستور عشاق میں پیش کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں:

"وجہی کو فتاحی کی حسن و دل جو نثر میں ہے ہاتھ لگ گئی تھی، دستور عشاق اس کی نظر سے نہیں

گذری تھی۔اس کے کئی وجوہ ہیں،ایک تو یہ کہ وجہی نے اپنی نثر میں اسی کا طرز اڑایا ہے۔ اور مسجع اور مقفٰی عبارت لکھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن امور کا ذکر دستور،عشاق میں مفصل ہے،اور نثر کے خلاصے میں سرسری یا برائے نام ہے ان کی تفصیل وجہی کے ہاں نہیں پائی جاتی"

اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ وجہی کے پیش نظر دستور عشاق اور حسن ودل دونو تھے،دستور عشاق کے جو بیانات حسن ودل میں سرسری ہیں وجہی نے ان کی تفصیل سے احتراز کیا ہے،:"

پروفیسر عزیز احمد کی رائے ہے کہ:

"وجہی حسن ودل کے قصے کے علاوہ دستورِ عشاق سے بھی واقف تھا اور اس نے عمداً دستور عشاق کی تفصیلات اور خضر کے معارف واسرار کے بیان سے احتراز کیا ہے"

لیکن یہ اندازہ لگانا واقعی مشکل ہے کہ اس کی نظر سے دستور عشاق گذری تھی یا نہیں کیونکہ سب رس میں اور دستور عشاق میں واقعات کے ضمن میں بہت سے جزوی اختلافات موجود ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر منظر اعظمی رقمطراز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وجہی نے سب رس میں قصہ حسن ودل کی ہو بہو تقلید کی ہے۔ قصہ حسن و دل دستور عشاق کی تلخیص ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے پیش نظر دستور عشاق بھی رہی ہو، جسکا امکان کم نظر آتا ہے۔دستور العشاق کے بارے میں دیوی سنگھ چوہان نے لکھا ہے کہ یہ سنسکرت الاصل ہے،اسکا ماخذ کرشن مشر کا تمثیلی سنسکرت ڈراما پربھو چندراودے ہے،اگر چہ دونوں میں تصوف کا رنگ ہے،لیکن پلاٹ اور کرداروں میں اس قدر یکسانیت نہیں ہے کہ پربھو چندراودے کے دستور العشاق کا ماخذ قرار دیا جاسکے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فتاحی کو ہندوستان کی کسی داستان سے ایسا مواد مل گیا ہوگا،جس کے واقعات کو اس نے اپنے طور پر ترتیب دے کر تمثیلی رنگ میں پیش کر سکا۔ سب رس خواہ کسی کا چربہ ہو وجہی نے اسے اپنے منفرد اسلوب سے ایسا جاندار بنا دیا کہ اس پر ترجمے یا چربے کا گمان تک نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک طبع زاد قصہ معلوم ہوتا ہے۔

3.2.4 اسلوب

یہاں پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال بھی آ سکتا ہے کہ سب رس کی اہمیت قصہ کی بنا پر ہے یا اسلوب کی بنا پر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قصہ بذات خود بڑا دل چسپ ہے۔ اگر قصہ دلچسپ نہ ہوتا تو مختلف زبانوں اور زمانوں میں مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اسے اپنی تصنیف کی بنیاد نہ بنایا ہوتا۔ اس قصے کو لامعی (سنہ وفات ۱۵۳۱ء) آہی (وفات ۱۵۱۷) نے ترکی زبان میں پیش کیا۔ عہد عالمگیری میں خواجہ محمد عبدل نے ۱۰۹۵ھ میں فارسی نثر میں لکھا۔ ذوقی نے 1109ھ میں، مجری 1086ء میں دکنی میں نظم کیا۔ تمام مصنفوں نے اس قصے کی پیش کش میں محمد یحیٰ ابن سیبک فتاحی سے خوشہ چینی کی ہے، سب رس میں قصہ سے بڑھ کر وجہی کا اسلوب اہمیت رکھتا ہے۔ وجہی خود دعویٰ کرتا ہے۔

جتے چوساراں، چتے فہم داراں، جتے گن کاراں ہوے
سن آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں
ہندی زبان سوں اس لطافت پس چھنداں سوں
نظم ہور نثر ملا کر گلا کر نین بولیا "

واقعی وجہی نے نثر میں ایک تجربہ کیا اس نے نثر کو نیا آہنگ دیا۔

اور

"فرہاد ہوکر دونوں جہاں نے آزاد ہوکر دانش کے تیشے
سوں پہاڑاں الٹا یا تو یو شیریں پایا تو یونوی
باٹ پیدا ہوئی تو اس باٹ آیا۔۔۔؟
یو عجب نظم ہور نثر ہے جانو بہشت میں کاقصر
ہے سطر سطر پر برستا ہے نور ہر ایک بول ہے یک حور۔ "

وجہی نے جو کچھ کہا ہے جو کچھ دعویٰ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے، اظہار کا ایک نیا راستہ نکالا ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سب رس کی اہمیت اسلوب کی بنا پر ہے، اس نے نثر میں شعریت پیدا کر دی ہے۔ نثر میں شاعری کی ہے، اس طرح اس نے اردو نثر کو

حیات نو بخشی۔ اس نے جو تعلی کی ہے کہ وہ اسلوب کے تعلق سے ہے۔ سب رس سے پہلے جو نثری نمونے ملتے ہیں وہ ادبی دلکشی سے محروم رہے ہیں۔ ان میں اسلوب کی تلاش بے سود ہے۔ وجہی نے پہلی مرتبہ اسلوب کی اہمیت کو سمجھا۔ اس نے مقفیٰ عبارت لکھی لیکن شگفتگی اور سلاست کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی بنا پر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ "سب رس اردو نثر کی تاریخ میں ایک واقع اور ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے"

3.2.5 مقفیٰ عبارت:

وجہی کو مختلف زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ بلا تکلف صفحے کے صفحے مقفیٰ عبارت لکھتا چلا جاتا ہے۔ نثر میں قافیہ کا اہتمام کرنا اور روانی کو برقرار رکھنا بے حد مشکل ہے۔ سب رس میں عبارت مقفیٰ ہونے کے باوجود بڑی روانی پائی جاتی ہے۔ اس نے مختلف زبانوں کے محاوروں، مقولوں، روزمرروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کیا ہے، جگہ جگہ آیتوں، حدیثوں کے برجستہ اور برمحل استعمال سے اسلوب کو مزین کیا ہے، آیتوں اور حدیثوں کے استعمال میں بھی قافیوں کا اہتمام کیا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

آیتوں کے ساتھ: وہ بے حد اس کی صفت کوں کا ہے، "احد احد صمد لم یلد ولم یولد" مبارک ہے جاگے تیرے نصیب، نصر من اللہ فتح قریب، حدیث کے ساتھ، یوں بھی ایک حدیث ہے پہچان کہ الانسان مراۃ الانسان

کہاوتوں کے ساتھ فارسی میں اور بولتے ہیں کوڑ پر پردائے ہیں فراموشی، جواب ابلہاں خاموشی اس بات کوں پایا کھوج کہاں گنگا تلی کہاں راجا بھوج،

یا اپنی جاگا پر تے نیں ہلتا بقول اہل ہند، چکنے گھڑے پر پانی ڈھلتا، اصل تے کچ خطائیں کم ذات نے وفائیں۔

جیسا کہ کہا جا چکا کہ وجہی کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اس نے مقفیٰ عبارت کو بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ چھوٹے اور بڑے جملوں میں توازن پیدا کرنے کا خاص ہنر

رکھا ہے، جملے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ایک خوشگوار آہنگ ملتا ہے۔ اس نے اپنے زمانے کی بامحاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے۔ وہ ہم قافیہ الفاظ کو جملوں میں اس انداز سے استعمال کرتا، اس سے عبارت میں ایک خاص آہنگ پیدا ہو جاتا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یو قدرت اللہ ہے یو اسرار اللہ ہے یو ہاتف اللہ ہے لا الہ الا اللہ یو عجب کتاب ہے، سبحان اللہ۔ اس کتاب کا ناوں سب رس، سب کو پڑھنے آوے، ہوس، بول بول کو چڑھے، اس یادگار ہوا چھے گا دنیا میں کئی لاکھ برس۔ یو کتاب سب کتاباں کا سرتاج، سب باتاں کا راج، ہر بات میں سو سو معراج، اس کا سوار سمجھے نا کوئی عاشق ناج، اس کتاب کی لذت پانے عالم سب محتاج۔"

دیکھئے وجہی نے کس سلاست اور روانی کے ساتھ مقفی عبارت لکھدی ہے۔ سب رس اردو نثر کا پہلا ادبی نقش ہے اور وجہی پہلا صاحب طرز ادیب ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

سوال ۱: سب رس کے سبب تالیف پر روشنی ڈالئے

سوال ۲: سب رس میں وجہی نے جو قصہ پیش کیا ہے اکا ماخذ کیا ہے۔

جواب ۱ اور جواب ۲: ان سوالوں کے جواب 3.2.1 اور 3.2.3 کے تحت دیکھئے،

وجہی تشبیہات و استعارات سے کام لینا خوب جانتا ہے۔ اچھوتی اور نادر تشبیہوں کے استعمال سے اس نے نثر کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے، اپنے اسلوب میں روانی پیدا کرنے کے لیے اس نے محاسن شعری سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، تجنیس، ایہام، مراعاۃ النظیر، تضاد وغیرہ صنعتوں کے استعمال سے جملوں میں بڑی روانی اور نغمگی پیدا کر دی ہے۔ اس نے جگہ جگہ خوبصورت اور برمحل اشعار اور دوہوں کا بھی استعمال کیا ہے۔

3.2.6 انشائیہ کی ابتدائی شکل:

سب رس میں انشائیہ کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے، اگر چہ جداگانہ حیثیت میں نہیں۔ وجہی قصہ بیان کرتے کرتے اصل موضوع سے ہٹ کر پند و موعظت کرنے لگتا ہے، مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا بے تکلف اظہار کرتا ہے۔ بعض ارباب نقد کا خیال ہے کہ پند و نصائح کی کثرت کی وجہ سے قصہ کا تسلسل بری طرح مجروح ہو گیا ہے۔ اس سے قصہ کی دلکشی میں کمی آ گئی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو سب رس میں اہم مقامات وہی ہیں جہاں وجہی نے اصل قصے سے ہٹ کر پند و موعظت کو جگہ دی ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں وہ اپنے عہد کے معاشرے پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔

3.2.7 تمثیل

تمثیل کے معنی ہیں "مثال دینے کے" یہ انگریزی لفظ Allegrey" کا ترجمہ ہے، تمثیل دراصل انشا پردازی کی اس طرز کو کہتے ہیں جس میں کسی تشبیہ یا استعارہ مجاز مرسل میں انسان کے کسی جذبہ کو مجسم مان کر یا دیوی دیوتاؤں کے پردے میں یا جانوروں اور پرندوں کے پردے میں کوئی قصہ گڑھ لیا جاتا ہے۔ ایسے قصوں کا مقصد دراصل کسی اخلاقی یا اصلاحی سبق کا دینا ہوتا ہے۔ تمثیلی قصے ہر زبان میں ملتے ہیں مثلاً فارسی میں انوار سہیلی، اور منطق الطیر عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ سب رس میں غیر مجسم کیفیات انسانی کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ حسن و عشق کا ربط و تعلق ازلی ہے۔ عشق بغیر حسن کے فراق و ہجر میں قید رہتا ہے۔ عقل لاکھ سمجھائے لیکن عشق کے آگے ایک نہیں چلتی۔ اسی طرح دوسرے کردار بھی انسانی زندگی کے اہم اور بنیادی جذبات اور لوازمات جیسے نظر غمزہ ناز صبر توبہ وغیرہ کو متشکل کر دیا ہے۔ تمثیل نگاری بڑا مشکل کام ہے، مگر وجہی نے اس مشکل کو 1635ء

میں جبکہ زبان ابھی اپنے ابتدائی دور میں تھی اس قدر کامیابی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ سب رس ایک تمثیل کے لحاظ سے ایک اکائی مختصر ہے جس میں آپ تفصیل سے پڑھیں گے۔

سب رس ایک بہترین داستان ہی نہیں ایک بہترین تمثیل بھی ہے۔ بقول رفیعہ سلطانہ "سب رس میں تصوف کے مراحل اور عشق کی واردات کو تمثیل کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں حکایات یا بیان بیک وقت دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ اس، میں ایک ادنیٰ سطح ہے جس میں عشق مجازی کے بیان سے دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔ اور دوسرے اعلیٰ سطح میں تصوف کے مقامات اور مراحل کی تشریح کی گئی ہے۔ اس نے حسن و عشق کو عشق کی داستاں میں علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔ "ناموس بولیا کہ اس تازہ آب حیات کا قصہ ایک تاویل دھرتا ے، ایک تمثیل دھرتا یے" قصہ میں بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے، وہ مصنف کا مدعا نہیں ہے بلکہ اسکی تہہ میں جو گہرائی ہے وہ پڑھنے والوں کو وہاں تک لے جانا چاہتا ہے۔ وہ سبق آموز باتیں بتانا چاہتا ہے۔

3.2.8 قصہ

سب رس کا بنیادی موضوع آب حیات کی تلاش ہے۔ ایک رات دل کسی قصہ خواں سے ایک تازے آب حیات کا قصہ سنتا ہے، تو اسے پانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ آب حیات کی خبر لانے کے لیے نظر کو بھیجتا ہے، آب حیات کی تلاش کرتے کرتے وہ حسن تک پہنچتا ہے۔ حسن نظر سے دل کی تعریف سن کر اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو جاتی ے۔ دل نظر سے کل احوال سنتا ہے اور حسن کی تصویر دیکھ کر اس پر سو جان سے فدا ہو جاتا ہے۔ اور حسن سے ملاقات کے لیے

نظر کے ساتھ شہر دیدار روانہ ہوتا ہے۔ بہت سے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ آخر کار حسن اور دل کی شادی کردی جاتی ہے۔ ایک دن دل، ہمت اور نظر شراب میں مست گلشن رخسار پہنچتے ہیں، اور آب حیات کے چشمہ کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ایک پیر سبز پوش نظر آئے یہ خضرؑ تھے۔ دل ہمت کے کہنے پر ان کی قدم بوسی کرتا ہے۔ خضرؑ آنکھوں کے اشارے سے سب راز کھول دیتے ہیں دل اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ اس کے بہت سے بیٹے ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا یہ کتاب سب رس ہے۔ جو اپنے وقت کا افلاطون ولقمان ہے۔ صاحب تدبیر ہے روشن ضمیر ہے اسی پر قصہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

3.2.9 آیات احادیث اشعار اور دوہوں کا استعمال

وجہی ایک زبردست عالم تھا۔ اسے مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے دور کے مروجہ علوم سے بہرہ ور تھا۔ سب رس میں اس نے آیات قرآنی، احادیث، نیز مختلف زبانوں کے اشعار، اقوال اور ضرب الامثال کا استعمال بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے اور اپنی تحریر کو مزین کیا ہے۔

آیات:

احد صمد لم یلد ولم یولد

کن فیکون

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ

نصر من اللہ وفتح قریب

احادیث: العلم نقطہ وکثرھا جھال

لولاک ما خلقت الافلاک

الحیاء من الایماں

اقوال عربی: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

العجیل من الشیطن والتانی من الرحمٰن

اقوال اہل ہند: پیاسا کیا منگتا پانی

چکنے گھڑے پر پانی ڈھلتا

دکنی امثال گھر کو دیوا تو مسجد کوں دیوا

گھر گھٹ کی دوڑ بازی لگن

جدھر ہنڈی ڈولی ادھر سب کوئی

جو سر یا پانی ہور وانہ تو دو یچہ ہوا بندی خانہ

اشعار: سند ہم جنس با ہم جنس پرواز کبوتر یا کبوتر باز بازباز

صد تجربہ شد حاصل درراہ بہر گاے

بسیار سفر باید تا پختہ سود خالے

سکندر رانمی بخشند آبے + بزور وزر میر نیست ایں اکار

حریفاں بادہ باخوردند ورفتند + تہی خم خانہ ہا کردند ورفتند

ہرگز تمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است میر جریدہ ء عالم دوام کا

اس ٹھار پر کسے ہے نظر جو نظر سے + گر جبرئیل ہوے تو یاں بال وپر سٹے

سفر کی کیا ہے خبر جو لگن دو گھر میں ہے+ سفر کیا سو وو جانے کہ کیا سفر میں ہے

دوہے: پوتی تھی سو کھوئی بھٹی پنڈت بھیانہ کوے

ایک ہی اچھر پیم کا پڑھے سو پنڈت ہوے

تیرے کرتب کرنے تے میں چپ ہوئی بدنام

میں میاتے تے اٹھ گی ء دتوں جانے تیرا کام

3.2.10 سماجی زندگی:

وجہی کے رنگین اسلوب کی وجہ سے اس زمانے کی عام زندگی کا واضح طور پر اندازہ نہیں ہوتا۔ پھر

بھی معاشرتی زندگی کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں مل ہی جاتی ہیں، جہاں وہ عقل و دل اور حسن و عشق کے معاملات اور دربار کا بیان لکھتا ہے، وہاں اپنے سرپرست بادشاہوں کی حکومت کا ڈھنگ ان کی حکمت عملی اپنے زمانے کی تہذیب و تمدن، اور معاشرت کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔ اس طرح دکن کے درباری حالات اور اس عہد کی زندگی پر دھندلی روشنی پڑ جاتی ہے۔

3.3. نمونہ امتحانی سوالات:

۱: سب رس پر ایک تنقیدی نوٹ لکھئے۔

۲: سب رس کے موضوع کی وضاحت کیجئے

۳: سب رس کی اہمیت قصہ کی بنا پر ہے یا اسلوب کی بنا پر ہے۔

۴: واضح کیجئے کہ سب رس ایک بہترین تمثیل ہے۔

۵: سب رس کی روشنی میں واضح کیجئے کہ وجہی مختلف زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔

3.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے سب رس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں، آپ کے علم میں آ چکا ہوگا کہ سب رس ایک بہترین داستان بھی ہے، تمثیل بھی ہم نے سب رس کے ماخذ سے آپ کو واقف کرایا ہے۔ اس اکائی میں آپ نے سب رس کے بارے میں آگہی حاصل کی اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی توقع ہے آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

3.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ایما	اشارہ	رسائی	پہنچ

معرکہ	لڑائی	ماخذ	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز نکلے
چربہ	خاکہ ہو بہو نقل	خوشہ چینی	دوسروں کی تخلیق سے فائدہ اٹھانا
تعلّی	شیخی		

3.6 سفارشی کتب

سب رس پر ایک نظر	سہیل بخاری
اردو میں تمثیل نگاری	منظر اعظمی
اردو کی نثری داستانیں	گیان چند جین
سب رس کی تنقیدی تدوین	حمیرہ جلیلی

ڈاکٹر۔یس مسعود سراج

پروفیسر وچیرمین، شعبہء اُردو،

میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۴) سب رس کی لسانی خصوصیات

ساخت:

4.0 اغراض و مقاصد

4.1 تمہید

4.2 سب رس کی لسانی خصوصیات

جمع بنانے کا طریقہ

4.2.1 ضمائر

4.2.2 اسم مکان، کیفیت

4.2.3 صفت

4.2.4 زمانہ

4.2.5 متعلق فعل

4.2.6 علامت فاعل

4.2.7 حرف

4.2.8 صوتی تجزیہ

4.2.9 املا

4.3 نمونہ امتحانی سوالات

4.4 خلاصہ

4.5 سفارشی کتب

4.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

اردو اور دکنی زبان کے فرق کو سمجھ سکیں

سب رس کی لسانی خصوصیات کو سمجھ سکیں اور اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

4.1 تمہید

آپ یہ جانتے ہیں کہ سب رس 1045ھ میں دکنی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کے مطالعے کے دوران آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو اسے عصر حاضر کی اردو سے الگ کرتی ہیں۔ نیز بہت سے عربی فارسی، الفاظ کا املا اور تلفظ بدلا ہوا ہے۔ دکنی، اردو کی اس منزلِ ارتقا کی نمائندگی کرتی ہے جب وہ تشکیلی حالت میں تھی، سب سے پہلے بہمنی عہد کے شاعر قریشی نے اپنے ایک منظوم رسالہ بھوگ بھل میں اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔ اس اکائی میں آپ کو دکنی زبان کی خصوصیات سے واقف کرایا جائیگا۔

4.2 لسانی خصوصیات: جمع بنانے کا طریقہ:

مذکر اور مونث اسما کی جمع "ان" بڑھا کر بنائی گئی ہے۔ جیسے پھول سے پھولاں، رات سے راتاں، کتاب سے کتاباں،

یو کتاب سے کتاباں کا سرتاج، سب باتاں کا راج،

ایسے پھولاں اجھوں کسی باغ میں نیں کھلے

بعض مذکر اسما جن کا خاتمہ "الف" "یا" "ہ" پر ہوتا ہے، ان کی جمع بناتے وقت "ان' کے اضافے سے قبل الف اور ہ کو ی سے بدل دیا گیا، غمزہ سے غمزیاں۔

غمزیاں نے باتاں بولے نخریاں کا ہجوم چڑیا عشویاں تے سراڑیا

بعض مذکر اسما جو الف یا ہ پر ختم ہوتے ہیں ان کی ہ گرا کر. 'الف' سے ملایا، یا ے مجہول سے بدل دیے گئے ہیں، جیسے پردہ پردا سے پردے، تماشا سے تماشے۔

غیب کے پردے انو کیوں کھولتے
دائم تماشے دیکھتی پھرتی تھی۔

بعض اسما کی جمع ات سے بنائی گئی ہے، جیسے تجلی سے تجلیات، تحقیق سے تحقیقات، صفت سے صفات، جو عربی کا طریقہ ہے۔

امرد کی شکل میں دیکھیا ہوں خدا کی تجلیات

فاعل اگر جمع مونث ہو تو فعل کی جمع بھی، 'ان" سے بنائی گئی ہے،۔

اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دوسرے کوں اپنا حق دکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں، اپنے مرد کوں ہر دو جہاں میں اپن دیں ایماں کر پیچھانتیاں ہیں۔

سب رس میں معاون فعل کی جمع مونث 'ان" بڑھا کر بنائی گئی ہے،

جو باتاں خدا کوں بھاتیاں تھیاں سو وچ میں آتیاں تھیاں

اسم فاعل: مصدر پر مذکر واحد کے لیے ہارا، ہار اور جمع مذکر کے لیے ہارے جمع مونث کے لیے ہاریاں، کے لاحقے لگا کر اسم فاعل بنائے گئے ہیں۔

ا۔سنسار کا سر جنہار:

۲۔اس بات کی جو کچھ بات ہے سو سمجھنارے کے بات ہے،

۳۔اگر سمجھنار او اصل ہور کا حاصل ہے وو ہندوی اگر ہے دانا ہے، اجالے کے رہنہاریاں سوں لڑتا جھگڑتا۔

4.2.1 ضمائر:

ضمیر شخصی:

حالت	واحد	جمع
فاعلی حالت	میں اپے	ہما، ہمیں

مفعولی حالت	منج مجھے، منج	ہمنا، ہمنا کوں
اضافی حالت	منج منجہ، میرا میرا	ہمارا، ہماری

جونماز کوں جاے تو یو جاننا کہ آپے خدا کے حضور جاتا ہوں

ہمارے گن کوں دیکھے سو ہمنا دیکھے

خوب ہمنا پہچانے گا

آب حیات کی بات کے طاقت نیں مجھ میں

میں بی جانتا ہوں

میں نفر تھا مجھے آسودگی ہوئی حرام۔

دانا موم دل ہے دانش کی آگ پر گلے گا ہمارا حکم اس پر چے کا

ضمیر مخاطب:

حالت	واحد	جمع
فاعلی	تو، توں	تم تمنا تمہیں
مفعولی	تجہ تجے تجھے	تمہیں
اضافی	ترا، تری	تمہارے

ے اے گونتی بھری توں دل لائی ہے

تجے بھوت بڑی ہوس آئی ہے

ے میں دل کو کیوں تیرے کنے لیاوں میں تجے کیوں دکھلاوں

دیکھیں تیرا ہنر

وونچہ تیری مراد ہوئینگی حاصل

ہمارے تمہارے میانے میاں پروردگار ہے کرکتا ہے، تجھ پر مجھے بہت آتا ہے رحم

ضمیر غائب:

حالت	واحد	جمع
فاعلی	انے، وو، ان نے، او، وہ، اوے	انوکوں، اینوکوں
مفعولی	اس اسے اس کوں اسکا	انو کا، اینو کا

انو دنیا میں لے آئے۔ انوکوں عربی میں حیواں ناطق کتے

اس درد کا دارو موتو نچہ ہے

ان نے سنیا کہ دل اتال جاتا ہے۔

اینوسوں قول قرار اچھ

ان دونوں نازنیناں نے

یو جھگڑا اسے کدھاں بھاتا ہے

وو عاشق صاحب صورت، صاحب محبت

اس تیر انداز کو

ضمیر موصول:

حالت	واحد	جمع
فاعلی	جن نے، جنے، جو	جنوں، جنو
مفعولی	جسے جس کوں	جنوں کوں، جنوکوں
اضافی	جس کا	جنو کا، جنو کی

جو کائی جو کام کرتا ہے سو پادشاہوں کو رجھانے خاطر کرتا ہے۔

جس کام پر قصد دھرتا ہے وہ کام کرتا ہے کہ یاں جسے خدا دیا اسے کوئی نیں لیا۔

جن نے آسودگی کو دسری عورت کیا

اس کے فرمانے پر جنو چلے ہر دو جہاں میں ہوئے بھلے

گھر وہن وو چہ جس کوں گھر ہے خوب　　　جنوں کوں خدا باٹ دکھلایا تھا

ضمیر استفہام

حالت	واحد	جمع
فاعلی	کون، کن، کنے	کن
مفعولی	کس، کس کوں، کس تے، کیا	
اضافی	کس کا	

اس کوے کوں کون سکے سرا

اپنے جنم میں کس سوں کری تھی یاری

کسے کیا کیے کنے کیا کیا

دل کی صفائی گن نے پائی

اس کوٹ کا ناؤں کیا ہے۔

ضمیر اشارہ

، ایو، اے، ان، انے ا، اس، انو، انوں، وہ، وو، او۔

اگر یو عالم اپس تے آپچ پیدا ہوا تو یوچ خدا ہے

اس دریا کی کسے نیں خبر

اگر اے دعوا نا کر جاتا تو کیا جانے عقل پر کیا دکھ آتا

ان کم ذات نے اپنی ذلت دکھلائی

جاہلاں کوں انو بی یوں کتے ہیں
جو کچھ وو کرے سو ہوے

ضمیر تنکیر

کوئی، کس کوں، کسی کے، کچھ، کچ
اس بات کوں اس نبات کوں کوئی آبِ حیات میں نیں گھولیا نہ کبھی کا دہاک نہ کسی کا ڈر
اس کی تدبیر کچھ کرنا
کد ہیں کچھ ہے کد ہیں سو کچھ کا کچ ،

4.2.3 اسم مکاں کیفیت

فارسی اور ہندی کی علاقیں لگا کر

ستاں بڑھا کر	جیسے	خارستاں گلستاں
زار بڑھا کر		لالہ زار، نرگس زار، گلزار
گاہ بڑھا کر		شکارگاہ
خانہ بڑھا کر		بندی خانہ

واڑی اور باڑی بڑھا کر پھلواڑی، پھول باڑی
اس پھول باڑی میں کھڑے کہ سائش پاے
رخسار کے گلزار میں آے
ڈھنڈتے ڈھنڈتے حسن کے غضب کے بندی خانے میں دل کوں پایا
غمزا نرگس زار میں اس عشویاں کے گلزار میں مست پھرتا تھا
شکار گاہ ہے اس کا حقیقت اور مجاز

اسم کیفت:

سب رس میں اسمائے کیفت تین طرح بنائے گئے ہیں

بعض اسم کیفت فعل سے ت اورٹ کے اضافے سے بنائے گئے بعض ایک لفظ کی تکرار یا دو لفظوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔ جیسے چلنت:

اس کا چلنت بی خدا کوں بھاے گا

اچاٹ ہر گز نیں جات، تلملات ہر گز نیں جاتا

جانو قدیم آشنا جانو قدیم جاں پہچان

بعض اسم کیفیت اسم سے بنائے گئے ہیں جیسے بھائی سے بھائی نیں،

دوست سے دوست داری، نفر سے نفرائی

وقت بھائی پنے ہور یاری کا وقت ہے

صنعت سے بنائے گئے اسما میں پن اور ٹی کا اضافہ ہوا ہے جیسے

نیں پن میں نظر اور غمزے کی ماں نے کھچ فر کی تھی

کڑوائی میں کون رکھے میٹھائی

اسم زماں + ہندی الفاظ کی مدد سے بنائے گئے ہیں

گنگا بھی دھوب کالے میں نہنی، برشکالے میں بڑی

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۱: سب رس میں الفاظ کی جمع کس طرح بنائی گئی ہے۔

سوال ۲: ضمیر شخصی کے لیے کون کونسے لفظ لائے گئے ہیں۔

جواب ۱ اور ۲ ان سوالوں کے جوابات .4.2 اور 4.2.1 کے تحت دیکھئے

لوازم اسم: بہت سے اسماذکر استعمال ہوے ہیں جواردو میں مونث بولے جاتے ہیں اور بہت سے اسماء مونث استعمال ہوے ہیں، جواردو میں مذکر بولے جاتے ہیں، کئی اسماء کہیں مذکر باندھے گئے ہیں کہیں۔ مونث وہ اسما جومذکر باندھے گئے ہیں۔

(۱) سکت کا گت اچھنا (۲) عاشقاں کے دلاں کا ضیافت (۳) شراب عشرت کا سنگاتی

(۴) انو کا راہ روشن انو کا چلنت جدا ہے (۵) پادشاہوں کا عمر دارز (۶) جسم میں عاشق کا جان ہے

(۷) ان آبحیات نے اس آبحیات کا رکھیا ہے لاج (۸) قیامت گذرتا ہے۔

(۹) اس پانی کے خاطر لوکاں مرتے (۱۰) فہم گھات کرتا ہے

وہ اسما جومونث استعمال ہوے ہیں:

(۱) اسے ہماری لگے کی ذکر

(۲) ہماری سلامتی کی فاتحہ پڑے گا

(۳) اگر کوئی بڑے ادب رکھیا تو ننھا نہیں ہوتا

وہ اسما جومذکر اور مونث دونوطرح استعمال ہوے ہیں

اس سیتاں کے بادشاہ کی ناؤں عقل ہے

جس کا ناؤں خدا ہے

عشق کی لذت گنوایا

دنیا کا لذّت تو یو شراب ہے۔

4.2.3 صفت:

صفت ذاتی: عموماً! دو ہندی وو فارسی، فارسی عربی، فارسی ہندی، الفاظ ملا کر صفت ذاتی بنائی گئی

ا۔ حسن نار، اوتار، خوش دیدار، خوش گفتار، خوش رفتار، من موہن، خوش فام، شیریں کلام، ادب دار، بہوگنی

سب رس میں صفات کے آگے نا، بے بدنر بڑھا کر منفی صفات بنائے گئے ہیں۔

بے ادب، بے تمیز، ادب دار، کو سب عزیز

نالائقاں کوں وہاں نیں آن دیتے، نا قابلاں کوں وہاں نیں جان دیتے وہ جھاڑا پیچ نراس

بے حیا، بے ایمان، بدکار، بدگماں، بے اعتبار، کی اعتباری نیں

صفت امدادی: عدد معین: سب رس میں عدد معین کا استعمال اسی طرح ہوا ہے جس طرح اردو میں رائج ہے۔

ایک بار، دو بار تین بار، مبالغہ چار بار دیا جائیگا۔

ہر ایک کوئی کسی کو دیکھا

عاشق ہوا چار لوگاں میں یہ نام ہوا تو کیا، ایک آپے لاکھ صفت، ہزار اور ایک اس کا ناؤں

البتہ کہیں کہیں مروجہ طریقہ کے خلاف بھی ہے، جیسے ایکس، ایکس مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے۔

ایک کے معنوں میں:

کوئی بھی کچھ لطافت دھرتا ہے، تو ایکس کے دل میں ٹھار کرتا ہے

وقت پر ایکس کوں کام آنا بہوت بڑا ثواب ہے

ہر ایک کے معنی میں

ہر یکس کوں ہر یکس سے قول قرار

کس کے معنی میں:

لھوئے تے لوکاں ڈرتے ہیں تو آکر یکس کی طاعت کرتے ہیں۔

عدد غیر معین کے لیے سب رس میں کیتک، لئی، سب، جتنے، اتنے، گئی، ایتا، بھوت، بہوت، کا استعمال ہوا ہے۔

ایتا جد جو دھرتے ہیں

خدا کی صفت کر کوئی کیتک

ایک عشق اسکے ایتے رنگاں

جتنے اتنے بہوت سہانے

عشق سب جاگا حاضر

برے لوکاں بہوت، بھلے لوکاں تھوڑے

کتے ہیں کیتک طالباں اپنے مرشد کوں پوچھے

معشوقاں میں لئی نازاں لئی چھنداں ہیں

فعل:

سب رس میں پڑنا، ہونا، تھے، تھی، اتھا، اہے، ہے، ہیں، افعال، ناقص ہیں۔

(ا) انوکوں یوں بھایا ہے۔

انوبی بات کوں کھولے ہیں

اس کا مطلب دل میں رہیا تھا

جو کچہ باتاں بولنے کیاں تھیاں

ہر ایک بول تیرا ناز غمزے سوں آتا ہے

جہاں جکچہ ہے، وہاں سب اہے ظہور اسکا

4.2.4 زمانہ:

ماضی: ماضی مطلق بنانے کے لیے مصدر کی علامت "نا" گرا کر عموماً یا بڑھا دیا گیا ہے،

جنے کچھ مجھیا عاقبت لگن اُنے اپنی جا گار کھیا اپنا گن

جنے اپس کو پچھانیا انے سب جانیا

ماضی قریب: ماضی مطلق کے بعد ہیں، ہے ہوں اضافے سے ماضی قریب بنایا گیا ہے۔

جو مصحف میں خدا کتا ہے۔

غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیا ہوں

ماضی بعید: ماضی مطلق کے بعد تھا، تھی اور تھے کہ اضافے سے بنایا گیا ہے،

بارے دوسو باس جو دل کنے آئی تھی، دل سے دل لائی تھی، دل اس کا ان نے پائی تھی۔

غمزا نرگس زار کے گلزار میں مست پھرتا تھا۔

ماضی استمراری:

جو جبرائیل خدا کے پاس تے خبر لیا تا تھا تو آدمی کی صورت ہو کر آتا تھا،

ماضی احتمالی: ماضی مطلق کے بعد اچھے گا یا اچھی گی کا اضافہ کیا گیا ہے

جد ہاں تے جو کوئی دنیا میں آیا اچھے گا، عجب ہے جو کوئی ایسا دغا کھایا اچھے گا،

ماضی شرطیہ: اگر محمدؐ نا ہوتا تو دین ہور دنیا نا ہوتا

حال:

فعل حال بنانے کے لیے مصدر سے علامت "نا" حذف کر کے "تا" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ واحد مذکر مخاطب، واحد مذکر غائب، کی صورت میں "تا" کے بعد ہے، "کا" اضافہ کیا گیا ہے۔ واحد متکلم میں ہوں بڑھایا گیا، جمع غائب اور جمع متکلم میں ہیں کا اضافہ کیا گیا، اور جمع مخاطب میں ہوں کا اضافہ کرتے ہیں، مونث کے صیغوں کے لیے تا کہ، الف کے بجائے یائے کا استعمال ہوتا ہے۔

واحد مذکر مخاطب: اگر بڑا ہو کر عالم کو سمجانے منگتا ہے تو یو کتاب دیکھ

رقیب دیکھتا ہے جو نظر میں جد ہر دہونڈتا ہے بی کدر نیں

واحد مذکر متکلم: وو آب حیاب جو منگتا ہوں اسے کوں پہچانے،

فارسی کے دانش منداں جنوں سمجھتے ہیں باتاں کے بنداں

واحد مونث متکلم: میں جانتی ہوں کس پانی سوں خمیر ہوں عشق کی خاک

مستقبل: مستقبل بنانے کے لیے مضارع کے بعد "گا" "گے" گی کا اضافہ کیا گیا ہے، جمع کے لیے

ن گ ے کا اضافہ کیا گیا ہے، کہیں کہیں سی کا اضافہ کیا گیا ہے،

ا۔ ذات کو صفات میں دھونڈیں گے تو پاویں گے

۲۔ صفات کو چھوڑ دے تو ذات لک کدھر تے آئیں گے

ماں باپ کی مہر دسرے میں نا آسی

بعض کتے ہیں خدا کوں س نظر سوں دیکھانا جاسی۔

فعل امر و نہی:

امر بنانے کے لیے علامت مصدر گرایا گیا ہے خدا کا ہونے منگتا ہے تو کچھ خدا کے کام کر

بنانے کے لے امر سے قبل یا بعد میں نہیں، نا اور نہ کا اضافہ کیا گیا ہے، لفظ نکو کا بھی استعمال ہوا ہے۔

اس کے حکم باج ذرا کیس نیں ہلتا

جہاں فہم کی بات آے وہاں کوڑ کی چھاؤں، نہ پڑیا جائے

ڈر نکو اس وقت ہر سمت بسر نکو

ایسی جا گا کچہ دل میں نا لیانا

مصدر: بہت سے مصادر اسی شکل میں ملتے، جیسے آج کی اردو میں مستعمل ہیں، جیسے "جدھر ڈھلنا ہے اُدھر عقل کے اجالے میں چلنا ہے" البتہ، بہت سے مصادر مختلف انداز میں ملتے ہیں، جیسے کاڑنا بمعنی نکالنا، بسلانا، (بٹھلانا) لیانا (لانا) وغیرہ۔

4.2.5 متعلق فعل:

متعلق زبان: وجہی نے متعلق زباں کے لیے مندرجہ زیل الفاظ استعمال کیے ہیں،

اتال۔ اب ۔ ہمیشہ ۔ بیگ (جلدی) ہمیشہ، دائم ۔ اوّل' پچھیں' پیچھے' آج' سدا' یکا یک' کد ہیں، آج وغیرہ۔

شراب کو اتال حرام کتے ہیں

مائی پھتر کی عمارت کچہ سدا رہنہاری تیں

یکا یک غیب تے کچہ رمز پاکر

متعلق مکاں: متعلق مکاں کے لیے سب رس میں مندرجہ ذیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

یاں۔ یہاں، واں۔وہاں ، جاں۔جہاں، کاں۔ کہاں، ایدھر۔ اِدھر، اودھر۔ ادھر، کدھر، آنگے ،انگے ،بھیتر، بہار، اوپر، تلے، نزدیک

یو بچار، نا اِدھر کا نا اُدھر کا کیا جانے کدھر کا

یہاں کھانا کھاتا تو وہاں پانی پیتا

کیں کا نیں سو جھگڑا کاڑتی

متعلق فعل استفہام: درجِ ذیل الفاظ متعلق فعل استفہام کے لیے استعمال ہوتے ہیں کیوں۔کی۔کیا ۔کاہے۔کاہے کوں۔ کیونکر۔

ایسے سوں کوئی کیوں رکھے اپے سنبھال

لڑ نیچہ پر آیا تو کیا پیچھے جاتا ہے

تجے کاہے کوں دسرے کی فکر

کیا جانے کیا گنہ کی تھی اوّل زمانے میں

متعلق فعل مقدار:

ایتا، تیا، اتنا، جیتا، کیچ، بہت، بہوت وغیرہ متعلق فعل مقدار کے لئے آئے ہیں

ایتی شراب کی بنائی

ایتا جد جو دھرتے ہیں

متعلق فعل سبب وعلت: اس وہات۔کیا واسطہ۔متعلق سبب علت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نیں کیا۔اس وہات بات کوں سلاست نیں دیا

کیا واسطہ کہ یو بات نہیں یو تمام وحی ہے الہام ہے۔

مرکب متعلق فعل: سب رس میں حسب ذیل مرکب متعلق فعل نظر آتے ہیں۔

کیں کا کیں، جد ہر تد ہر، کد ہر کد ہر، آس پاس، واں لگن، یا لگ، کد ہیں کد ہیں ادھر اِدھر۔

اِدھر اُدھر کیاں جد ھر تد ھر کیا سنایا

جاں لگن بھلا آدمی ہے واں لگن خواری

ایک ہی اسم سے مرکب بنانے کے لیے اس کے درمیاں میں "ے" کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جیسے بالیں، بال۔ پاتیں پات۔ ٹھاریں ٹھار۔ ٹھاویں ٹھاوں۔ راتیں رات، ہزار اور ایک اس کا ناؤں اس کی معرفت ٹھاویں ٹھاؤں۔ "ے" سے پاتیں پات جیو بہلتا۔

باٹے باٹ، بازارے بازار۔ ٹھارے ٹھار۔ گھرے گھر۔ چمنے چمن، جنگلے جنگل، گھرے گھر مکرے زماں بہایا۔

علامت اضافت: کا' کی' کے بطور علامت اضافت استعمال ہوے ہیں۔

عاشق کا دیوانے، ہونا چ کام

عقل کی دوڑ بہت دور ہے

4.2.6 علامت فاعل "نے" کا استعمال:

سب رس میں ماضی متعلق، ماضی قریب، و بعید، فعل لازم و متعدی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اکثر، فاعل کا تابع ہوتا ہے۔ ان افعال کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے، جن کے ساتھ اردو مین نہیں ہوتا ہے۔

۱۔ ماضی مطلق کے ساتھ:

یو آگ غیر نے سلگائی۔ عشق نے ہمت کو گلے لگایا

۲۔ ماضی قریب کے ساتھ:

ان عاشق کامل نے کیا بولیا ہے دل نے حسن خاطر بہت جفا دیکھیا ہے۔

ہمت نے مکتوب لکھیا تھا سو قامت کے انگے کھولیا

۴۔فعل لازم کے ساتھ: رقیب نے روسیاہ نے بےنصیب نے بولیا توں کہاں کا ہے

۵۔فعل متعدی کے ساتھ

القصہ کیتک وقت کوں سورج نے سر کاڑیا

۶۔فاعل کے تابع: بادشاہوں نے دنیا کا خط چھوڑے خلق کا دل توڑے

۷۔بطور مفعول آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرتا۔

۸۔علامت مفعول: سب رس میں کو اور کوں دونوں استعمال ہوے ہیں۔

جاہل تھے تو لھواں سوں انو کوں مارے نہ اپس کوں جانے نہ دسرے کو پچھانے

4.2.7 حرف:

سب رس میں حرف کی وہ صورتیں بھی ملتی ہیں جو موجودہ اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔

حرف جار: سب رس میں۔میں۔منے۔سوں نے۔ستی۔سو۔تھے۔پو۔

پر۔سنگات وغیرہ حروف جار کا استعمال ہوا ہے۔

صفاتاں کو چھوڑ دیتے: ذات لک کدھر تے آیں گے

یوں دل کے دل میں رہے ہوس

اس کی یاد میں نا رہتے

اسے ایمان نیں ایسے تے ڈرنا

جسے خدا کی محبت سوں غرض ہے اس پر فاتحہ ہمارا فرض ہے

منہ پو مسجد دل میں بت خانہ

آدم وہی ہے جو کرے آدم ستی آدم گری

حروف جمع: ہو، اور "و"

جو کچھ آسمان ہورز میں میں ہے، سو اس کتاب میں ہے۔

اگر یو میانے آوے اور اپس کوں یوں کوا ے نعوذ باللہ کافر ہوے یا مردود ہو جاوے

حرف استثنا: بن۔ باج۔ بغیر

اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سنی ما

اس کا سواد سمجے نا کوئی عاشق باج

کو خدا بن حال کوں کون اس کے انپڑے

کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال ہوتے ہیں

جوں۔ جیسے۔ جیسیاں

اس شہر کے عمارتاں جیسیاں کے کسی شہر میں کوئی آج لک نیں بندھایا

کنول کے پھول کے پھنکڑیاں جیسے ہات

نازک نرم جوں پھول جوں ابریشم

حرف تاکید: حرف تاکید کے لیے لفظ کے آخر میں چ یا چہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہے سو یو چہ پانی ہے

سمجی کہ یو حسینچہ ہے جو کری ہے اتنا ناز

کیا بولوں تماشا چ ہے

حرف تاکید چ مراہٹی سے دکنی میں آیا ہے یہ، حرف اسم ضمیر فعل اور صفت سبھی کے ساتھ ہو کر اس کی تخصیص میں اضافہ کر دیتا ہے۔

4.2.8 صوتی تجزیہ:

بعض الفاظ میں مختصر صورتوں کو طویل کر دیا گیا ے، جیسے جاگا (جگہ)، اودھر (اُدھر)، ایدھر (ادھر)، چھوپانا (چھپانا) دیکھلائے (دکھلائے) وغیرہ۔

جنے کچھ سمجیا عاقبت لگن انے اپنی جاگا رکھیا اپنا گن

بعض طویل مصوتوں کو مختصر کر دیا گیا ہے، جیسے بُند (بوند)، پچھے (پیچھے) سنا (سونا) بی (بھی) انو (انہوں)

مست ہتی بادشاہ ہور باگ اگر عاشق ہے تو بند بند کا لذت دیکھ

انو کی خوشی ہور دسریاں کی خوشی کیوں ہوتی برابر

پچھیں کیوں اسے کہنا خدا کا سایہ

کوزی آوازوں (ٹ، ڈ، ڑ) کو دندانی آوازوں (ت، و، ر) سے بدل دیا گیا ہے۔ دھنڈتے دھنڈتے حسن کے غضب کے بندی خانے میں دل کوں پایا

جو دھنڈنا پانا ہے سو انکھیا چہ میں ہے

بہتے پانی کوں کھڑا کرے۔ ارتے جناور کوں پارے

بعض ہلکی آوازوں کو بھاری کر دیا گیا ہے اور بھاری آوازوں کو ہلکا کر دیا گیا ہے۔

سنگھاتی (سنگاتی) الٹھانا (الٹانا) منگتا (مانگتا) واڑی (ڈاڑھی)

بعض ایسے الفاظ جو اردو میں غنہ سے بولے جاتے ہیں ان سے غنہ ساقط کر دیا گیا۔ کوا (کنواں) ڈاواں ڈول (ڈانواں ڈول) موچھیاں (مونچھیاں)

لگن رخسار کے گلزار میں ایک کنواں ہے

بعض الفاظ کہیں بغیر غنہ کے اور کہیں غنہ کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔

منجے۔ مجھے، انو۔ انوں، تو، توں

منجے تی تو کچھ خطا نہیں ہوا

انو پر خدا کی نیں رحمت

جو کوئی نفر ہے انو کوں سمجھے گا

بعض الفاظ جو یائے معروف یا یائے مجہول پر ختم ہوتے ہیں کہیں کہیں ان پر نون غنہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

تلے۔ تلیں۔ پیچھے، پچھیں۔

حسن کی نظر تلیں تی اپس کی چھپائی

آب حیات کا چشمہ نظر تلے تے چھپیا

تقلیب: بعض الفاظ میں تقلب کا عمل ملتا ہے، جیسے، پھتر (پتھر) پھنکڑیاں، (پنکھڑیاں) نھاٹنا (ناٹھنا)

کنول کے پھول کے پھنکڑیاں جیسے ہات

4.2.9 املا

ایسے الفاظ جن کے آخر میں "ہ" آتا ہے انہیں الف سے لکھا گیا ہے۔

بندا (بندہ) قصا (قصہ) قطرا (قطرہ) وغیرہ

دریا میں تے قطرا ابھار پڑا

بعض الفاظ جو ع پر ختم ہوتے ہیں، انہیں الف سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسے نفا (نفع)، جما (جمع) وضا (وضع) برقا (برقع) وغیرہ

جس کے دل کوں صفا ہے اسے بھوت نفا ہے

سب رس کی لسانی خصوصیات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دکنی زبان کے الفاظ اور جو موجودہ اردو میں کس قدر فرق ہے۔ اس اکائی کے مطالع سے دونوں زبانوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائیگا۔

4.3 نمونہ امتحانی سولات

۱: سب رس کی لسانی خصوصیات بیان کیجئے۔

۲: صوتی اعتبار سے دکنی زبان کے الفاظ موجودہ اردو کے الفاظ سے کس قدر مختلف ہیں۔

۳: سب رس میں ضمیروں کے لیے کون کونسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۴: سب رس میں متعلق زماں، مکاں، استفہام کے لیے کن الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے

4.4 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو سب رس کی لسانی خصوصیات سے واقف کرایا ہے، آپ نے

اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کے دکنی زباں کس طرح موجودہ اردو سے مختلف ہے۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی اور آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے

4.5 سفارشی کتب:

۱۔ سب رس	مرتبہ مولوی عبدالحق
۲۔ سب رس کی تنقیدی تدوین	مرتبہ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی
۳۔ ہندوستانی لسانیات	سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر لیس مسعود سراج

پروفیسر و چیرمین، شعبہء اُردو

میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۵) سب رس بہ حیثیت داستان

مباحث

5.0 اغراض ومقاصد

5.1 تمہید

5.2 داستان کا فن

5.2.1 قدیم قصوں کی قسمیں

5.2.2 داستان کی خصوصیات

5.2.3 سبرس بحیثیت داستان

5.3 نمونہ امتحانی سوالات

5.4 خلاصہ

5.5 فرہنگ

5.6 سفارشی کتب

5.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ قدیم قصوں کی اقسام

☆ داستان کی خصوصیات اور

☆ سب رس کو داستان کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔

5.1 تمہید

اس اکائی میں داستاں کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اردو زبان کی پہلی داسان سب رس کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ دستان ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045 میں لکھی۔

5.2 داستان کا فن:

آپ تو یہ جانتے ہوں گے کہ انسان کو ابتدا ہی سے کہانیاں سننے اور سنانے میں دلچسپی رہی ہے۔ یہی اس کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ دن بھر کے کام سے فراغت پا کر جب لوگ آگ کے الاؤ کے چاروں طرف گھیرا بنا کر بیٹھتے تھے تو ان میں سے کوئی کہانی سناتا اور باقی لوگ کہانی سنتے تھے۔ انسانی سماج میں اس فن کا آغاز اسی وقت ہو گیا جب انسانی تہذیب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ کہانی سننا اور سنانا انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ یہ بات کسی ایک طبقے ایک گروہ یا ایک ملک تک محدود نہیں اس میں پس ماندہ ملک بھی شامل ہیں، اور ترقی پسند ممالک بھی۔ آج سے صدیوں پہلے انسان نے کہانیوں کے ذریعے اپنی فطرت کا اظہار کیا۔ انہیں کے ذریعے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھے۔ کئی ممالک میں قصہ سنانا ایک مستقل فن کی صورت تھا، جسے لوگ بطور پیشہ بھی اختیار کرتے ہوئے اکثر قصہ خواں درباروں سے وابستہ ہوتے تھے۔

5.2.1 قدیم قصوں کی قسمیں:

قدیم قصوں کو اہلِ مغرب نے چار اقسام میں تقسیم کیا ہے، یعنی فیبل، میتھ، لیجنڈ اور رومانس۔

Fable فیبل : اس میں ایک سیدھا سادا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جس میں حیوان یا بے جان اشیاء سے اخلاقی تلقین کا کام لیا جاتا ہے، وہ انسانوں جیسی گفتگو اور کام کاج کرتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال طوطا کہانی ہے۔

Myth میتھ : ان میں وہ روایتیں پیش کی جاتی ہیں، جو مذاہب اور دیومالا کے پراسرار عقائد اور توہمات کی تاویل کرتی ہیں۔

Legnends لیجنڈ : کسی قوم یا گروہ کی نیم تاریخ روایت ہوتی ہیں۔ جیسے فرہاد کا جوئے شیر بہا کر لانا، لیلیٰ مجنوں کے عشق کی داستان وغیرہ۔

Romance رومانس : کسی غیر معمولی واقعے کا نثری یا منظوم بیان ہوتا ہے اس کے اجزا جنگ وجدل، حسن و عشق اور مذہب ہوتے ہیں۔ داستان بڑی حد تک رومانس سے مشابہ ہے۔

5.2.2 داستان کی خصوصیات:

آپ تو یہ جانتے ہیں کہ داستان بنیادی طور پر کہنے کا یا سنانے کا فن ہے اس میں ایک خیالی دنیا ہوتی ہے اس میں ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جن میں کوئی تبدیلی شروع سے آخر تک نہیں ہوتی۔ داستانوں میں ہیرو اور اسکے ساتھیوں کے کارنامے، ان کے مہمات اور حسن و عشق کا تذکرہ ہوتا ہے، محیر العقول واقعات ایک قابل لحاظ طوالت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، ایک غیر معمولی فضا پیدا کی جاتی ہے، اس میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے، مبالغہ واقعہ نگاری میں بھی ہوتا ہے، منظر نگاری اور کردار نگاری میں بھی۔

داستان کے ہیرو کا تعلق طبقہ بالا سے ہوتا ہے۔ عام طور پر کوئی شہزادہ ہوتا ہے، یہ بادشاہ کا اکلوتا یا سب سے چھوٹا بیٹا ہوتا ہے جو بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بڑا ہی حسین و جمیل ہوتا ہے، بڑا ہی اولعزم اور مہم جو ہوتا ہے۔ کم سنی ہی میں تمام علوم پر دسترس حاصل کر لیتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں منفرد ہوتا ہے۔ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے وطن سے نکلتا ہے یا اپنے دوست کو روانہ کرتا ہے، راستے میں اسے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

وہ بڑی پامردی سے مشکلوں کا سامنا کرتا ہے۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے، آخری میں وہ فاتحانہ شان سے اپنے وطن واپس آتا ہے، عام طور پر ہیروئین ہیرو کے ملک سے بہت دور کسی اور ملک میں ہوتی ہے۔ ہیرو اسے خواب میں دیکھ کر یا اس کا تذکرہ کسی سے سن کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کو پانے تک بے تاب رہتا ہے، اس کو پانے کے لئے صحرا کی خاک چھانتا ہے، جن، دیو، پریوں سے ملتا ہے۔

جادوگروں کے سحر کا شکار بھی ہوتا ہے۔ اس سے آزاد بھی ہوتا ہے، کبھی وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسائل اور مشکلوں کو حل کرتا ہے، کبھی کسی کی دعا اس کے کام آتی ہے، کبھی اسے غیبی تائید حاصل ہوتی ہے۔ آخر کار وہ ہیروئن تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ ہیروئین بھی اسے دیکھتے ہی اس پر دل و جان سے فدا ہو جاتی ہے، بعض اوقات دونو ملک کر بچھڑ جاتے ہیں، جدائی کا باعث نامساعد حالات ہوتے ہیں، یا کسی جن، دیو یا پری کی کارستانی۔ کبھی ہیرو کے سامنے شادی کے لئے کچھ کڑی شرطیں بھی رکھی جاتی ہیں۔ جنہیں وہ ہنسی خوشی قبول کر لیتا ہے، اور انہیں پورا کرتا ہے۔ اور ہیروئین کو حاصل کر کے واپس لوٹتا ہے۔

داستانوں میں ہیرو اور ہیروئین کے علاوہ، عیار، جادوگر، جادوگرنی، حکیم، پیر، خفر، جن، دیو، پری، پری زاد

بھی ہوتے ہیں، ان میں عیار کا کردار سب سے زیادہ قابل توجہ ہوتا ہے۔ اس کی چالیں بڑی دلفریب ہوتی ہیں۔

داستان گو قصے میں مسلسل دلچسپی قائم رکھنے کے لئے داستان کے انجام کو ٹالتا رہتا ہے، وہ تفصیل و اطناب سے کام لیتا ہے۔ وہ داستاں کو طول دینے کے لئے ضمنی قصے بھی بیان کرتا ہے، جن کا بیشتر اوقات اصل داستان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی اصل قصہ کے درمیان دوسرا قصہ بیان کر دیا جاتا ہے، قصہ در قصہ اور ضمنی کہانیوں کے اصل ذریعہ تجسس کو بڑھایا جاتا ہے، تاکہ سننے والے انجام معلوم کرنے کے مشتاق رہیں، امان علی خان غالب لکھنوی نے لکھا ہے کہ داستان کے چار عناصر ہیں، رزم، بزم، طلسم، اور عیاری، یہاں ہر قدم پر حیرت انگیز واقعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو مناظر پیش کیے جاتے ہیں وہ دلچسپ اور عجیب ہوتے ہیں یہاں کی ہر شئے انوکھی ہے نرالی ہے۔ شاندار ہے، عام دنیا کی اشیاء سے مختلف ہے یہاں شہر ہیں تو بے انتہا آباد ہیں۔ بازار ہیں تو ان میں بہت چہل پہل اور رونق ہے۔ عورتیں ایسی حسین ہیں کہ حوروں کو شرماتی ہیں۔

مرد ایسے بہادر ہیں کہ ان کے آگے رستم و سہراب ہیچ ہیں، داستان میں حسن کی کرشمہ سازیاں اور عشق کی رنگا رنگیاں ہیں، زندگی کی نیرنگیاں دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ یہ دنیا حقیقی دنیا سے مختلف اور حسین تر ہے، ایسی کے پڑھنے والے اس میں کچھ دیر کے لئے ہی سہی محو ہو جاتے ہیں۔

بقول کلیم الدین احمد:

"جب ہم داستان کو پڑھتے ہیں تو اپنے کو کسی دوسری دنیا میں پاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی روح کو کسی سرحد سے گذار کر ہم ایک ایسے مقام پر جا پہنچے ہیں، جو اجنبی سا ہے جس سے ہم پہلے نا آشنا تھے۔ جہاں ہر شئے نئی، حیرت انگیز، اور پر اسرار معلوم ہوتی ہے، اس سلطنت کی سرکار نئی ہے۔ قوانین نئے ہیں، ساری فضا انوکھی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ چیزیں جانی بوجھی ہی ہیں، شروع میں اچھنبا تو ضرور ہوتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ ہماری حیرت مٹنے لگتی ہے، اور ہم مختلف چیزوں کو پہچاننے لگتے ہیں، گویا کبھی پہلے سینکڑوں برس پہلے اپنی روح بھی اس دنیا میں بستی تھی۔ یا کبھی اس نے اس ملک کی سیر کی تھی، لیکن اسے مدت ہوئی اور زمانے کی رفتار، وقت کی پرواز نے جاتے ہوئے نقوش کو دل سے بھلا دیا تھا۔ مگر نقوش یک قلم مٹنے نہ پائے تھے، حافظے میں محفوظ تھے اور پھر ابھر آئے یا ایسی کیفیت ہوتی ہے، جیسے کسی نے کوئی دلچسپ خواب دیکھا اور یکا یک وہ خواب حقیقت سے بدل گیا ہو۔"

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ داستان میں واقعات کی تکرار نہیں ہوتی البتہ یہ ضرور ہے

کہ ایک ہی طرح کے واقعات بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں واقعات کی ہو بہو تکرار نہیں ہوتی، تفصیلات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ہر بار وہ واقعہ کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا محفوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک منظر کے پیش کرنے میں پورا زور قلم صرف کر ڈالا کہ دوسرا منظر پیش کرنا پڑا یہاں بھی داستاں گو گونا گوں تفصیلات پیش کرتا ہے، ہر بار کوئی نہ کوئی نیا پہلو پیش کرتا ہے، اگر چہ اس سے داستان طوالت کا شکار تو ہو جاتی ہے لیکن طوالت گراں نہیں گزرتی

داستاں گو بیان واقعہ میں جن باتوں کا خیال رکھتے تھے، اس پر خواجہ امان نے حدائق النظار کے دیباچہ میں اس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"اول مطلب مطول وخوش نما جس کی تمہید و بندش میں توارد مضمون وتکرارِ بیان واقع نہو اور مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں۔

دوم بجز مدعائے خوش ترکیب اور مطلب دلچسپ کوئی

عبارت سامع خراش وہزل مثل تعریف باغ وہ کہکشاں

یا مکان وآرائش مکان درج نہ کیا جاوے۔۔۔۔۔

سوئم لطافت زبان وفصاحت بیان

چہارم عبارت سریع الفہم جو واسطے فن قصہ گوئی لازم ہے۔"

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستاں کو نہ صرف قصہ کو طول دینے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ اس بات کی کوشش بھی کرتے تھے کہ اختتام تک سامعین کا اشتیاق برقرار رہے۔ جہاں تک ممکن ہو بیان واقعہ کو قابل قبول بنا کر پیش کرتے تھے، وہ سریع الفہم عبارت کو قصہ گوئی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

داستان میں تفن طبع کا سامان بھی موجود ہوتا ہے۔

اسکے ساتھ ساتھ قصہ بیاں کرنے کے ضمن میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔ داستان کی اہمیت اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ اس میں ہماری تہذیبی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع محفوظ ہیں۔ یہ ہماری تہذیبی زندگی کا بیش قیمت ورثہ ہیں، ان کے مطالعے سے لوگوں کے عقائد ان کے تصورات، اعتقادات ان کی طرز زندگی ان کے رسم وراج کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ داستان میں ہر طرح کی نثر کے نمونے موجود ہیں، اور اس الفاظ ومحاورات اور اصطلاحات کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ داستاں کی اہم خوبی

رجائیت ہے۔ یہاں معرکہ خیر وشر میں ہمیشہ فتح خیر کی ہوتی ہے، انجام طربیہ پر ہوتا ہے، یہاں معاشی خوش حالی ہے، امن وسکوں ہے، بے تعلقی ہے، یہاں ہر شئے رنگ ونور میں ڈوبی ہوتی ہے۔

5.2.3 سب رس بحیثیت داستان:

آئے اب ہم سب رس کا داستان کی حیثیت سے جائزہ لیں گے۔ سب رس ملا وجہی ہی کی نہیں دکنی کی شاہکار تصنیف ہے۔ اردو میں یہ ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے، اس سے پہلے جو نثری تصانیف ملتی ہیں، وہ مذہبی نوعیت کی ہیں ان میں وہ ادبی شان جلوہ گر نہیں جو سب رس کا نمایاں وصف ہے۔ وجہی نے سب رس عبداللہ قطب شاہ کی ایما پر سنہ 1435 میں تصنیف کی۔ وجہی نے سب رس میں عشق ودل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

وجہی نے کہیں اپنے قصے کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قصہ اس کے ذہن کا اختراع ہے۔ وجہی کا یہ دعویٰ محض دعویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجہی نے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی تصنیف قصہ حسن ودل کا چربہ اڑایا ہے۔ فتاحی نے ایک طویل مثنوی دستور عشاق کے نام سے لکھی۔ اس قصہ کو شبستاں خیال اور "حسن ودل" میں بھی پیش کیا ہے۔

5.2.3.1 سب رس کا پلاٹ:

داستاں گو چونکہ اپنی ساری قوت کو تخیل کی پرواز پر صرف کر دیتے ہیں۔ وہ واقعات کی ترتیب وتنظیم پر زیادہ توجہ نہیں کر پاتے، سب رس کا قصہ بڑا دلکش ہے۔ وجہی قصہ بیان کرتے کرتے درمیاں میں پند وموعظت کے دفتر کھول دیتا ہے۔ جس سے قصہ کا تسلسل مجروح ہو جاتا ہے۔ عقل ملک سیستاں کا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے دل کو ملک تن کی بادشاہت عطا کر دی۔ ایک دن دل نے اپنے کسی ندیم سے آب حیات کا قصہ سنا تو اسے پانے کے لئے بے چین ہو گیا۔ دل کے ایما پر آب حیات کا پتہ لگانے کے لئے نظر روانہ ہوا۔ آخر کار وہ پتہ لگانے میں کامیاب ہو گیا، آب حیات کا چشمہ شہر دیدار کے باغ رخسار میں ہے۔ شہر دیدار بادشاہ عشق کی مملکت میں ہے۔ جہاں اس کی بیٹی حسن رہتی ہے۔ شہر دیدار میں نظر کی ملاقات اپنے بھائی غمزہ سے ہوتی ہے

جو بچپن میں جدا ہو گیا تھا۔ غمزہ نظر کو حسن کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ یہ بڑا جوہری ہے۔ حسن نظر کو ایک ہیرا دکھاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ اس میں کس کی تصویر ہے۔ نظر بتاتا ہے کہ یہ دل کی تصویر ہے۔ نظر دل کی تعریف ایسے انداز سے کرتا ہے کہ حسن اس پر عاشق ہو جاتی ہے، یہاں سے آب حیات کے قصے کے ساتھ ایک نیا قصہ حسن و دل کے معاشقہ کا شروع ہوتا ہے۔

حسن دل کے بلانے کے لئے اپنے غلام خیال کے ساتھ نظر کو روانہ کرتی ہے، عقل وزیر وہم کے کہنے پر دل اور نظر کی گرفتاری کا حکم دیتا ہے۔

نظر حسن کی دی ہوئی جادوئی انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور زندان سے بھاگ نکلتا ہے۔ چلتے چلتے وہ آبِ حیات کے چشمہ تک پہنچتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آبِ حیات پی لے۔ جوں ہی وہ منہ کھولتا ہے انگوٹھی پانی میں گر پڑتی ہے۔ اور وہ سب کو دکھائی دینے لگتا ہے، رقیب اس کو قید کر دیتا ہے۔ نظر کو اس وقت لٹ کی یاد آتی ہے، جس نے اس کو بال دیے تھے۔ نظر بال جلاتے ہیں لٹ حاضر ہوتی ہے، اسے قید سے چھڑاتی ہے۔ نظر شہر دیدار پہنچ کر حسن کو ساری روداد سناتا ہے، وہ دل کو قید سے چھڑانے کے لیے نظر کے ہمراہ غمزہ کو بھیجتی ہے، نظر اور غمزہ توبہ کو شکست دے کر شہر عافیت پہنچتے ہیں۔

وہاں بادشاہ ناموس پر فتح پا کر شہر تن کی جانب پیش قدمی کرنے لگتے ہیں، اس موقع پر دعائے سیفی دم کر کے غمزہ لشکر کو ہرنوں کے ڈار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ توبہ کی شکست کے بعد عقل دل کو رہا کر دیتا ہے، اور یہ مشورہ دیتا ہے کہ اگر شہر دیدار جانا ہے، تو فوج لیکر جاؤ، دل باپ کی بات مان لیتا ہے، دونوں لشکر لیکر روانہ ہوتے ہیں۔

حسن کو جب اس لشکر کی آمد کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ سے مدد مانگتی ہے۔ عشق ایک لشکر لانے سپہ سالار مہر کی سرکردگی میں روانہ کرتا ہے۔ حسن اپنے خادم خال کے کہنے پر اپنی ہمزاد کو کوہ قاف سے مدد کے لیے بلا لیتی ہے

اس جنگ میں عقل کی شکست ہوتی ہے، وہ میدان سے بھاگ نکلتا ہے، دل پر بھی ایک تیر لگتا ہے، ہلاک اسکو پناہ دیتا ہے، اس فتح پر حسن بہت مسرور ہوتی ہے۔ اس کے حکم سے عقل کو گرفتار کیا جاتا ہے اور دل کو چاہ ذقن میں قید کر دیا جاتا ہے۔ دل کو حسن کی سہیلی زلف چاہ ذقن سے نکالتی ہے۔ کچھ روز دونوں میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔

رقیب کی بیٹی غیر کو جب حسن و دل کی محبت کا راز معلوم ہوا تو اس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ وہ ایک روز جادو کے زور سے حسن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وصال کے چھجے پر دل سے وصل

حاصل کرتی ہے۔ اس بات پر حسن برافروختہ ہوکر غیر کو محل سے نکال دیتی ہے، دل کو غضب کے قید خانے میں ڈال دیتی ہے۔ کچھ دنوں بعد پشیماں ہوکر غیر اقبال جرم کرلیتی ہے۔ حسن غیر اور دل کی خطائیں معاف کردیتی ہے۔

ادھر عقل کی شکست خوردہ فوج کے سپاہی ہمت ایک بار پھر قوت مجتمع کرکے شہر دیدار کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسی میں بھلائی نظر آتی ہے کہ عشق اور عقل میں صلح ہوجائے ہمت کی مصالحت سے عشق عقل کو اپنا وزیر بنالیتا ہے۔ دل کو قلعہ ہجراں سے رہا کردیا جاتا ہے۔ دل اور حسن کا عقد ہوجاتا ہے۔

ایک دن دل ہمت اور نظر تینوں شراب میں غرق گلشن رخسار پہنچتے ہیں۔ وہاں چشمہ آب حیات دیکھتے ہیں، اور خضرؑ سے ملاقات کرتے ہیں۔ خضرؑ اسرار معرفت سمجھاتے ہیں۔ ان کے فیض سے دل اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔ اس کے بہت بیٹے ہوتے ہیں، جن میں سب سے بڑا بیٹا یہ کتاب ہے۔

سب رس کا قصہ دل چسپ بھی ہے اور تہ دار بھی۔ اس کے مرکزی کردار حسن و دل ہیں۔ حسن عشق کی بیٹی ہے اور دل، عقل کا بیٹا ہے، عشق مشرق کا بادشاہ ہے۔ بڑی شان و شوکت والا بادشاہ ہے، اسے عقل اور دل کی لشکر کشی کی اطلاع ملتی ہے تو خود مقابلے کے لئے نہیں جاتا، اپنے سپہ سالار کو روانہ کرتا ہے۔ خود مقابلہ کرنا وہ کسر شان سمجھتا ہے۔ جنگ میں عقل کو شکست ہوتی ہے، تو ہمت کی گذارش پر اپنے دربار میں مدعو کرتا ہے، اس کی عزت افزائی کرتا ہے، اور اپنا وزیر بنالیتا ہے۔

عقل مغرب کا بادشاہ ہے۔ وہ بادشاہ ہی نہیں شفیق باپ بھی ہے۔ جب دل مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے ایک لشکر کو لیکر جاتا ہے۔ عشق کا پلہ بھاری دیکھ کر اس کی ماتحتی قبول کرلیتا ہے، عشق اور عقل میں کشمکش اور جنگ ازل سے جاری ہے اور رہے گی اس نے افراد کے نہیں قوموں کی حیات و موت کے فیصلے کیے انسان کے خمیر میں عشق اور عقل دونوں کی کارفرمائی ہے۔ عشق میں جرائت ہے عقل پیمانہ سود و زیاں ہے۔ دونوں کی کشمکش ازل سے جاری ہے اور جاری رہے گی اسی ہی سے زندگی، زندگی ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے طلب گار ہیں۔ حسن کو باپ کے رتبے کا خیال ہے ساتھ ہی ساتھ موقع کی نزاکتوں کا احساس بھی وہ دل کو دل سے چاہتی ہے۔ دل کو غیر کی آغوش میں دیکھ کر اس کا قہر و غضب میں آجانا فطری بات ہے۔ غیر جب اقبال جرم کرلیتی ے۔ تو حسن کی غلط فہمی دور ہوجاتی ہے۔ وہ دل کو معاف کردیتی ہے۔ دل حسن پر سو جان سے فدا ہے وہ عاشق صادق ہے۔ صعوبتوں کے باوجود ثابت قدم رہتا ہے۔

دل اس داستان کا ہیرو ہے۔ وہ ایک دن شراب کے عالم میں ایک ندیم سے آب حیات کا ذکر سن کر اسے پانے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ یہاں سے تلاش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو عام طور پر داستانوں کی اہمیت کا باعث ہوتا ہے اس کام کے لیئے دل نظر کا انتخاب کرتا ہے۔ جو ہر جگہ پھرتا ہے، ہر پل کی خبر لا کر دیتا ہے۔ نظر آب حیات کی تلاش میں نکلتا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک اونچے پہاڑ کے پاس پہنچتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے اس پہاڑ کا نام زہد ہے اس پر رزق نام کا ایک بوڑھا رہتا ہے۔ وہ پہاڑ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"جاتے جاتے تلملاتے تلملاتے، حیفی کھاتے کھاتے بات میں دیکھیا ایک ڈونگر عظیم الشان، دسرا آسمان۔ ہر ایک کھورے میں اس کے چاند سورج کا مکان، ہر ایک جھاڑ کی بیل اس پر جیوں کہکشاں۔ خیال کا ہات اس پر نہیں پڑتا، نظر اسکی بلندی پر نہیں جاتی۔ کچواتی بھی پھر پھر آتی۔۔۔۔ نظر کوں بہوت تھی اپنے طلب کی آس، باوہو کر ڈونگر پر چڑ گیا"۔

داستاں گو جو بھی منظر پیش کرتے ہیں، اس میں بے حد مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ پہاڑ کا تذکرہ کرتے ہوئے وجہی بھی مبالغے سے کام لیتا ہے۔ وہ کرداروں کو بھی پیش کرتے ہوئے مبالغے سے کام لیتا ہے۔ حسن کا کردار ان لفظوں میں پیش کرتا ہے۔

"حسن نار اوتار، خوش دیدار، خوش گفتار، دیدیاں کا سنگار، دل کا ادہار پھول ڈالی تے خوب لٹکتی، چلنے میں ہنس کو لٹکتی، روایں نے میٹھی بولے بات آواز تے قمری کوں کرلے شہ مات۔ کنول کے پھول کی پنکڑیاں جیسے ہاتھ۔۔۔ لاج تے آسمان پر چڑے چاند سور، مست ہی نے مغرور ماتی بھاتی، کسے خاطر نہیں لاتی۔ بال جانو کالے ناگ گال جانو عشق کی آگ۔۔۔۔"

اگر چہ اس میں وجہی نے حسن کا سراپا تو پیش کر دیا لیکن حسن کی کوئی واضح تصویر نہیں ابھرتی۔

5.2.3.2 مافوق الفطرت عناصر:

وہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مافوق الفطرت عناصر سے کام لیتا ہے، لٹ نظر کو بال دیتی ہے، اور کہتی ہے کہ اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو ان کو جلانا میں تمہاری مدد کو ضرور آؤنگی، شہزادی حسن نظر کو ایک انگوٹھی دیتی ہے جس کی یہ خصوصیت ہے کہ جو شخص بھی اسے منہ میں رکھ لے وہ کسی کو نظر نہیں آتا، غمزہ دعائے سیفی اپنے لشکر پر پھونک دیتا ہے، سارا لشکر ہرنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حسن کا خادم خال حسن کو مشورہ دیتا ہے کہ مدد کے لئے اپنی ہمزاد کو بلوائے جو کوہ قاف میں رہتی ہے۔ خال عنبر کا ایک دانہ آگ پر رکھتا ہے، اور وہ آموجود ہوتی ہے۔

"رقیب کی بیٹی غیر، جادو کے زور سے اپنا روپ بدل کر حسن کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور سحر کے زور سے وصال کے چھجے سے اوجھل ہو جاتی ہے، رقیب دل کو سحر کے ذریعے غضب کے قید خانے سے اڑا لاتا ہے، اور ہجراں کے قلعے میں قید کر دیتا ہے۔

5.2.3.3. معاشرتی زندگی کی جھلک:

وجہی جہاں عقل و دل اور حسن و عشق کے معاملات اور دربار کا حال لکھتا ہے۔ وہیں اپنے سرپرست بادشاہوں کی حکومت کا ڈھنگ ان کی حکمت عملی، اس دور کی تہذیب، سماج اور معاشرت کا ذکر بھی کرتا جاتا ہے، اس طرح سب رس کے مطالع سے دکن کے درباری حالات اور اس عہد کی زندگی پر دھندلی سی روشنی پڑ ہی جاتی ہے

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۱: داستاں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھئے۔

سوال ۲: قدیم قصوں کی کتنی قسمیں بتائی گئی ہیں۔

جواب ۱ و جواب ۲ ان سوالوں کے جواب 5.2.1 کے تحت دیکھئے۔

وجہی کے زمانے میں دکن کے بادشاہ بے دھڑک شراب پیا کرتے تھے۔ سوائے محمد قطب شاہ کے عہد کے کسی بھی عہد میں شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وجہی "دل" کے بیان میں بادشاہوں کے لئے مے نوشی کو جائز قرار دیتا ہے۔ بادشاہ شراب کے ساتھ ساتھ موسیقی اور شاہدانِ غنچہ دہن کے فریفتہ تھے۔ درباروں میں راگ و رنگ کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، ندیم شاعر قصہ خواں اور حسینوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ درباروں میں شاہنامے کے ساتھ ساتھ قصے اور لطیفے ہی سنے جاتے۔ پان کھانے کا رواج عام تھا۔ بادشاہ بطور انعام پان کا بیڑا عنایت کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقعوں پر آرائش کا اہتمام کیا جاتا ہے، منڈوے بنائے جاتے، اور شامیانے تانے جاتے۔ رات کو خوب روشنی ہوتی۔ رقص و سرور کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ لوگ تماشا دیکھتے۔

بادشاہ دوسرے ملکوں میں جاسوس بھیجتے۔ وقتِ ضرورت بادشاہ سرحدوں کی ناکہ بندی بھی کرتے تھے۔

مرد کئی عورتیں رکھتے تھے۔ شاہد باز بھی ہوتے تھے، طوائفیں موجود تھیں، ان کے بے وفائی کے چرچے بھی عام تھے۔ سب رس کے مطالعے سے اس عہد کی عورتوں کے زیورات اور آرائش کا پتہ چلتا ہے۔ زیوروں میں نتھ، چوڑیاں، گھنگھرو، پازیب، چھاگل، توڑے، کنٹھ مالا ہار، آرسی وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے۔ عورتیں سنگھار میں عطر، کاجل، اور مہندی لگایا کرتی تھیں، موسیقی کے سازوں میں کمانچ، قانون، عود، دف، دائرا جنگ اور رباب کا بیان ملتا ہے۔

5.2.3.4 اخلاقی پہلو : جیسا کہ بتایا جاچکا ہے داستانِ میں تنفس طبع کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا ساماں بھی موجود ہوتا ہے۔۔۔سب رس جابجا اخلاقی نکات ملتے ہیں اس میں ابدی اقدار کی طرف اشارے بھی موجود ہیں۔ وجہی ہمت کو مرد کی اہم صفت قرار دیتا ہے، طمع کی خدمت کرتا ہے۔ سخاوت اور ہمت کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ کثرت ازدواج کو معاشرے کی خرابی سمجھتا ہے۔ وہ بادشاہ کی اہم ترین اوصاف، عدل، سخاوت اور رعایا پروری بتاتا ہے۔ وہ وفا، جانبازی اور جانثاری کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ عورتوں کے صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"عورت اسے کتے ہیں جو مرد کے دل کو بھلاوے نہ مرد کا دل عورت نے واز ہو جاوے۔ پیار آتا ہے، سوجی نہ آوے۔ کھائیاں کا ناز توبہ استغفر اللہ ایسے نازاں تے جیو واز۔ ۔۔عورت میں مہر و محبت پیار اچھنا۔۔۔عورت میں بات گفتار اچھا۔"

اصیل عورتاں اپنے مرد بغیر دسرے مردکوں اپنا حسن دیکھلانا گناہ کر جاں تیاں ہیں۔ اپنے مرد کو ہر دو جہاں میں اپنا دین ایمان کر پچھاں تیاں ہیں طبع کی مذمت کرتے ہوئے وجہی لکھتا ہے۔

"بہوت طمع تے بہت اہے زیاں، بہوت طمع عزت کو نقصان، بہوت طمع تے رہتا نیں مان، بہوت طمع تے آدمی دین گنواتا، بہوت طمع تے آدمی کا ایمان جاتا۔"

5.2.3.5 اسلوب:

سب رس کی قابلِ قدر خوبی اس کا اسلوب ہے جس پر خود وجہی کو بڑا فخر ہے۔ وجہی خود دعویٰ کرتا ہے کہ:

"ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نئیں کیا۔ اس دھات بات کوں سلاست نیں دیا۔ جیتے جو ساراں جیتے فہم داراں۔ جیتے لگن کا واں ہوئے سن آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور، نثر ملا کر یوں گلا کریون نیں بولیا۔ میں تو یو بات نیں کیا ہوں عیسیٰ ہو کر بات کوں جیو دیا ہوں۔ یوج عجب نظم ہور نثر ہے جانو بہشت میں قصر ہے۔ سطر سطر پر برستا ہے۔ نور ہر ایک بول ہے ایک حور۔ اِتا نوی باٹ پاڑیا کاڑیا سو گنج کاڑیا کچھ نیں تھا تو لیایا، باٹ دکھلایا ہمیں تو بہوت سند سوں باٹ سنوارے اتال چل لیوے باٹ چلنہارے۔"

وجہی نے نظم اور نثر کو گھلا ملا کر ایک ایسا اسلوب واضع کیا جو اس سے مخصوص ہے۔ وجہی نے مسجع مقفیٰ عبارت لکھی لیکن شگفتگی اور سلاست کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

'سب رس اردو نثر کی تاریخ میں ایک واقع اور ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے"۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"سب رس اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے، اور اس فضیلت اور تقدم کو ماننا پڑتا ہے، نثر میں قافیہ کا التزام بذاتِ خود ایک ایسی چیز ہے، کہ تکلف اور آورد سے بچنا محال ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس پابندی کی وجہ سے بعض مقامات پر عبارت محض تک بندی ہو کر رہ گئی ہے، اور ادائے مطلب میں بھونڈا پن نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بے حد فصاحت روانی اور سلاست پائی جاتی ہے"۔

وجہی نے اپنے اسلوب میں وقار پیدا کرنے کے لئے مختلف زبانوں کے محاوروں، مقولوں روزمروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ اور جگہ جگہ آیتوں، حدیثوں کے برجستہ اور برمحل استعمال سے اسلوب بیان کو مزین کیا ہے، سب رس کی عبارت زیادہ تر مقفیٰ ہے، مگر اس کے باوجود اس میں روانی پائی جاتی ہے۔

"دل کہیا اے نار اوتار، شیریں گفتار، ہنس مکھ کبک رفتار خورشید دیدار، عاشقاں کی انکھیاں کا سنگھار، عشق میں بدنامی جوں کھانے میں نمک، جو دیوے، میں جھمک جیون محبوب میں ٹھمک۔

کرامت کتے سو عقل تمام، جکچھ دنیا میں ہوا سو سب عقل کا کام عقل تی ہوا سب حلال سو رحرام۔ عقل تی پکڑیا فرق خاص ہور عام، عقل تی رکھے ہر ایک کا نام نیں تو کاں تھا صبح ہور شام، شیشہ ہور جام، پستہ بادام، صیاد

دام صاحب غلام، مبارک ہے جاگے تیرے نصیب کہ نصیر اللہ فتح قریب۔ گھر گھٹ کی دوڑ باڑی لگن، جدھر ہنڈی ڈولی ادھر سب کوئی۔

دکنی امثال: گھر کو دیوا تو مسجد کو دیوا۔ جوں سر یا پانی ہور دانہ تو وو بچہ ہوا بندی خانہ۔

دکنی اقوال: لوٹ میں لوٹ کا کلوٹ، منگے سو جلے نیں منگے سو بھلے جتنی محبت اتنی جھل۔

عربی کے اقوال: صبوری تے دنیا صبوری تے دین مصحف کی آیت ہے۔ اِنَّ اللہ مع الصابرین۔

دانایاں میں یوں چلی ہے بات، العقل نصف الکراما

اس نے جگہ جگہ اشعار کا استعمال بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔

5.3 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ داستاں کی اہم خصوصیات واضح کیجئے؟

۲۔ سب رس میں داستانی عناصر کی نشاندہی کیجئے۔

۳۔ ایک داستان کی حیثیت سے سب رس کا جائزہ لیجئے۔

۴۔ سب رس کے پیش نظر وجہی کے اسلوب پر روشنی ڈالیے۔

5.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو داستان کے فن سے واقف کراتے ہوئے سب رس کا داستاں کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ داستاں کا فن کن خصوصیات کا حامل ہے، اور سب رس ایک اہم داستان ہے۔ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی۔ سفارشی کتب کا حوالہ بھی، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

5.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
تلقین	نصیحت	مافوق الفطرت	فطرت سے برتر
سحر	جادو	نامساعد	ناموافق
مطول	لمبا	اطناب	طوالت

5.6 سفارشی کتب:

۱۔ اُردو کی نثری داستانیں۔ — گیان چند جین

۲۔ سب رس کی تنقیدی تدوین۔ — حمیرہ جلیلی

۳۔ سب رس پر ایک نظر۔ — سہیل بخاری۔

ڈاکٹر لیس۔ مسعود سراج

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو

میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۶) وجہی کی انشائیہ نگاری

ساخت:

6.0 اغراض ومقاصد

6.1 تمہید

6.2 انشائیہ کی تعریف

6.2.1 انشائیہ کی خصوصیات

6.2.2 وجہی بحیثیت انشاء پرداز

6.3 نمونہ امتحانی سوالات

6.4 خلاصہ

6.5 فرہنگ

6.6 سفارشی کتب

6.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ انشائیہ

☆ انشائیہ اور مضمون

☆ وجہی کی انشائیہ نگاری سے واقفیت حاصل کر سکیں اور انہیں اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

6.1 تمہید:

اس اکائی میں انشائیہ کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وجہی کو ایک انشائیہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ پچھلی اکائیوں میں آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ سب رس ایک تمثیلی داستاں ہے۔ وجہی قصہ بیان کرتے

کرتے پند و موعظت کے دفتر کھول دیتا ہے۔ جس سے قصہ کا تسلسل مجروح ہو گیا ہے۔ یہ بھی آپ کو بتایا گیا ہے کہ وجہی نے سب رس میں جو قصہ پیش کیا ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے بلکہ اس نے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشا پوری کی تصنیف قصہ حسن و دل کا چربہ اڑایا ہے۔ وجہی نے جہاں اعلیٰ قصے سے ہٹ کر اپنے خیالات کا بے تکلف اظہار کیا ہے۔ وہی حصے سب رس میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، وہی انشائیے ہیں۔

6.2 انشائیہ کی تعریف

انشائیہ کی بہت سے تعریفیں کی گئی ہیں، سب جامع تعریف جانسن نے کی ہے وہ کہتا ہے It is a loose sally of mind یعنی یہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔ سچ پوچھئے تو یہی ذہن کی آزاد موج یا ترنگ اس صنف کی روح ہے۔ اس صنف کی شناخت ہے اس کی یہی خوبی اسے دوسری اصناف سے ممتاز و ممیز کرتی ہے، اگر آپ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ترنگ کا لفظ جہاں اس کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے وہیں خوش گوار انتشار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں جس صنف کو Essay کہا جاتا ہے اور کبھی کبھی جس صنف کے تعین کے لئے Personal Essay, Light Essay یا Familiar Essay کہا جاتا ہے اس کے لیے اُردو میں انشائیہ کی اصطلاح ، کی گئی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ انشائیہ مضمون یا مقالے سے بہت مختلف ہے ہمارے یہاں مضمون نگار تو بہت ہیں لیکن انشائیہ نگار بہت کم ہیں لفظ مضمون تو بہت وسیع اور آزادانہ طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہر اس بات یا خیال جس کو نثر میں پیش کر دیا جاتا ہے عام طور پر مضمون کہا جاتا ہے، انشائیہ مقالے سے بھی مختلف ہے۔ مقالہ سنجیدہ، علمی اور معلوماتی ہوتا ہے۔

6.2.1 انشائیہ کی خصوصیات

انشائیہ ایک ہلکی پھلکی تخلیقی صنف ہے۔ یہ شخصی جذبات و احساسات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لیے مونٹین اسے ذاتی تصویر Self Portrait کہتا ہے، اس پر مصنف کی شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ انشائیہ اس اعتبار سے شخصی ہوتا ہے، اس کا سارا حسن حسنِ عبارت میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے خیال پارے میں

انشائیہ کی خصوصیات پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"ایک چیز جو انشائیہ کو دوسرے اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریقہ کار ہے۔ دراصل انشایہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائیل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گھما گھمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریقہ کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردّعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقہء احباب میں شامل کر لے۔

انشائیہ نگار غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردّعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پاس کئی ایسی باتیں کہنے کی ہوتی ہیں جنہیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے، اس طور پر کے آپ اس کے دائرہ احباب میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ زیر بحث تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطہء نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل اور اکمل صورت اختیار کرے وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے، لیکن اس مرکزیت کا سہارا لیکر بہت سی ایسی باتیں بھی کہدی جاتی ہیں، جس کا موضوع سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالہ کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (Loose) ہوتا ہے۔ اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی، انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔۔۔۔ ایک آخر چیز جسے انشایہ کا وصف سمجھنا چاہیے اس کی تازگی ہے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطہ نظر کا وہ انوکھا پن ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔"

اوپر وزیر آغا کے مضمون سے جو اقتباسات دیے گئے ہیں آپ انہیں دھیان سے پڑھیئے آپ کو انشائیہ کے صنفی تعین میں آسانی ہوگی، اور آپ پر بڑی حد تک انشائیہ کے خدوخال واضح ہو جائیں گے۔

انشائیہ میں سب سے اہم چیز انشائیہ نگار کا غیر رسمی طریقہ کار ہے۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار کسی اصول کے تحت نہیں کرتا بلکہ آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے خیالات میں ایک طرح بہاؤ ہوتا

ہے، انشائیہ میں نہ ربط ہوتا ہے، نہ تسلسل بقول نظیر صدیقی "یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا ضروری نہیں، جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے"۔ انشائیہ نگار مربوط انداز میں کسی مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالتا۔ انشائیہ فلسفیانہ سنجیدگی، تفصیل اور تسلسل کا بھی متحمل نہیں ہوتا۔ یہاں بات اشاروں اشاروں میں آگے بڑھائی جاتی ہے۔ یہاں اختصار سے کام لیا جاتا ہے، اختصار ہی اس کی بڑی خوبی ہے۔اختصار ہی اس کا اعجاز ہے۔

انشائیہ نگار کا مقصد نشاطی اور انبساطی ہے مسرت آفرینی اور لطف اندوزی ہے، وہ اپنے خیالات کو اس خوش اسلوبی سے پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے محظوظ ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں طنز و مزاح بھی ضروری ہے، ظرافت و مزاح کے استعمال سے انشائیہ میں دلکشی پیدا ہو جاتی ہے، انشائیہ میں چونکہ موضوع کی کوئی قید نہیں۔ انشائیہ نگار انسانی زندگی کے چھوٹے بڑے معمولی و غیر معمولی واقعات کو اپنا موضوع بناتا ہے۔اور نئے نئے پہلو پیش کرتا ہے، اسطرح وہ مسرت بھی بہم پہنچاتا ہے بصیرت بھی۔

6.2.2. وجہی بحیثیت انشائیہ نگار:

آیئے اب سب رس کے ان مضامین کا جائزہ لیں جن پر انشائیہ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری کہ اُردو میں انشائیہ نگاری کو مغرب کے اثر سے فروغ ہوا، انشائیہ کے اولین نقوش ہمیں سب رس میں ملتے ہیں ہمیں وجہی کو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے۔

کہنے کو وجہی نے داستان لکھی ہے لیکن اس میں قصے سے ہٹ کر اس نے دنیا کی روزمرہ زندگی کا دلکش نقشہ کھینچا ہے، فطرت انسانی کی نیرنگیوں کی بہترین تصویریں پیش کی ہیں۔مقامی ماحول کی عکاسی بھی کی ہے اور اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، اپنے عہد کے معاشرے پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے، جہاں وہ اصل قصہ سے ہٹ گیا ہے وہیں ہمیں انشائیہ نظر آتے ہیں، اور جو چیز ہمیں اس کے انشائیوں میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا شگفتہ انداز بیان ہے، اس نے نظم اور نثر کو گھلا ملا کر ایسا اسلوب وضع کیا جو اس سے مخصوص ہے۔ مقفی عبارت لکھنے کے باوجود اس نے کہیں سلاست اور شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ کہتا ہے۔

"بھوت نادر نادر باتاں بولیاں ہوں۔دریا ہو کر موتیاں رولیاں ہوں"

وجہی نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ اُسے اس بات کی امید ہے کہ شاید

"کدھیں کوئی عاشق پھرے ٹک تلملے، تک چہ پھرے، ٹک مستی چھرے ٹک ترپر ھے ہور سمجھے کہ ان عاشق کامل

نے کیا بولیا ہے کس کس جاگا پر کیسے کیسے بھیداں کھولیا ہے، ہم گلاب میں آبلو چ گھولیا ہے ہم مانگ موتی رولیا ہے۔۔۔۔یہی نہیں وجہی کو اپنی خوبیوں کا پوری طرح ادراک تھا اسے معلوم تھا کہ ہماری بات میں عجب کچ نُونا ہے۔ جنے سینا ہے انے گھائل ہونا ہے،۔۔۔۔اس کیساتھ وہ اس بات کا دعویٰ بھی کرتا ہے کہ "جتنے گن کار کرتے ہیں گن اسی بات نے لیں گے پھول چن چن۔۔۔جکوئی اچایا بنیاد اول آخر وہی بنیاد"۔

اگر چہ وجہی نے اس صنف کو کوئی نام نہیں دیا تاہم اسے اس بات کا شعور تھا کہ وہ قصے سے ہٹ کر جو کچھ تحریر کر رہا ہے وہ لطافت بیان میں سحر سے کم نہیں۔ وہ ایک انوکھی صنف ہے، سب سے الگ اور منفرد ہے۔ اس نے انشائیوں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔خواہ شراب پر اس کے خیالات ہوں یا عورت پر حسن پر اس کی عبارت ہو یا عقل پر ہم انہیں انشائیے کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ نے ملا وجہی کے انشائیے کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں وجہی کے ۶۱ انشائیے اکٹھے کر دیے ہیں۔ یہ دراصل وہ تحریریں ہیں جو وجہی نے اصل قصے سے ہٹ کر سپرد قلم کی ہیں۔ اصل قصے کو جاوید وششٹ نے قصہ حسن و دل کے نام سے شائع کیا۔

ڈاکٹر جاوید وشسٹ کا یہ خیال درست ہے کہ "ملا وجہی اردو انشائیہ کا باوا آدم ہے۔جس وقت عالمی ادب میں انشائیے کی صنف نے جنم لیا کم وبیش اسی وقت ہمارا انشائیہ بھی عالم وجود میں آیا۔ ملا وجہی کے یہ اکسٹھ انشائیے جن کے بیشتر عنوانات اکہرے مگر انشائیے بڑے تہہ دار ہیں عالمی معیار انشائیہ پر پورے اترتے ہیں، وجہی کے جی نیس Genius ہونے کے ثبوت میں بھی یہ انشائیہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جاوید وشسٹ نے وجہی کے کل انشائیوں کی تعداد ۶۱ بتائی ہے، اور موضوعات کے اعتبار سے انہیں آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ان کی کیفت درج ذیل ہے،

۱۔فطرت انسانی سے متعلق	۱۸
۲۔تصوف انسانی سے متعلق	۱۱
۳۔عشق انسانی سے متعلق	۱۱
۴۔شابیات انسانی سے متلعق	۷
۵۔مذہبت انسانی سے متعلق	۷
۶۔سماج انسانی سے متعلق	۵
۷۔ خمریات انسانی سے متعلق	۱

۹۔فنون لطیفہ انسانی سے متعلق

کل تعداد انشاءۂ

اگر بعض انشائیوں کو ایک ہی عنوان کے تحت رکھیں تو یہ تعداد گھٹائی بھی جا سکتی ہے۔جیسے حسن عشق، عاشق، معشوق، عشق ہو حسن، عشق جلنا ہے ہے عشق تپنا ہے، چوری سوں عشق کھیلنا، عاشق کی آنکھ کا پانی، ان تمام انشائیوں کو ایک ہی عنوان کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

وجہی کے انشائیوں کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

ا۔خدا ۲۔ذکر و فر۔ ۳۔نماز ۴۔نیکی، ۵۔ شکر و صبر، ۶۔حسن، ۷۔عشق، ۸۔ جہالت، ۹۔طمع ، ۱۰۔ ہمت، ۱۱۔سخاوت، ۱۲۔توکل وقناعت، ۱۳۔نیند، ۱۴۔شراب، ۱۵۔عورت، مرد ۱۶۔ سوکن، ۱۷۔ فراق و وصال، ۱۸۔ دنیا، ۱۹۔ دیدار، ۲۰۔ انکھیاں۔ ۲۱، دیدار، ۲۲۔پاشاہ، ۲۳۔ بادشاہی، ۲۴۔میدان جنگ، ۲۵۔ اناالحق، ۲۶۔ذات ہور صفات، ۲۷۔نفس، ۲۸۔میدان جنگ، ۲۹۔دل، ۳۰۔عقل، ۳۱۔فقر۔ ۳۲۔ دشمن، ۳۳۔داناں ہور ناداں، ۳۴۔ جھوٹے سچے، ۳۵۔ راز وغیرہ۔

وجہی کی فنکارانہ عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے آپ وجہی کے انشائیے کا بھی مطالعہ کیجیے اور قصہ حسن ودل کا بھی وجہی کے بیشتر انشائیہ انسانی فطرت سے متعلق ہیں۔اگرچہ بیشتر عنوانات کو دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ ان میں کوئی نیا پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن آپ ان انشائیوں کو پڑھیں تو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی وجہی نے انہیں نئے زاویے سے پیش کیا ہے، تازگی ان انشائیوں کا اہم وصف ہے۔وجہی نے بہت ہی غور وفکر کے بعد ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اس نے ماحول اور معاشرے سے عبرت وبصیرت اور مسرت بھی حاصل کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ ؛نمونہ جوابات

سوال ۱ انشائیہ کیا ہے۔

سوال ۲ وجہی کے انشائیوں کو موضوعاتی اعتبار سے کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

جواب ۱ اور جواب ۲ ان سوالوں کے جواب 6.2 اور 6.2.2 کے تحت دیکھئے۔

وجہی کے انشائیوں میں بڑا تنوع ہے۔موضوع کے اعتبار سے ہم ان انشائیوں کو کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، جیسے اخلاقی، مذہبی، صوفیانہ، انشائیے وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ وجہی نے بہت بے تکلف انداز میں

ان موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، اکثر انشائیے بہت مختصر اور جامع ہیں۔ وہ مرد اور عورت کی نفسیات کو خوب جانتا ہے، ان کا اچھی طرح تجزیہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر عورت پر اس کے خیالات ملاحظہ کیجئے۔

"عورت عجب ہے شکر ولے اس شکر میں تمام بھرے ہیں مگر، بولے ہیں کہ شر شیطان تی مکر زنان نی خدا اپنی پناہ میں رکھے یو دونوں بلایاں ہیں اس بلایاں کوں کوں جیت سکے۔۔۔۔ یو کیا دنیا میں عورتاں ہو کر آئیاں ہیں، یو عورتاں نہیں خدا کیا بلایاں ہیں، گھر میں اچھ کر ایتا غلیلا کرتیاں اگر یو بھار نکلتیاں تو کیا بلا کرتیاں۔۔۔۔ دعوا بڑا عقل نھنی سر شیتچہ انو کی یوں نہی عورت ناقص عقل ہے۔ یو قدیم نقل ہے۔ جیتا عقل مندی ہوئی تو بی عورت کی ذات، کیا اعتبار ہے عورت کی بات، عورت اپنے گھر وار کوں خوب ہے،۔۔۔ گھر کا دھندا اس کا کام ہے۔ بعض دھندے کا اسے کیا فام ہے، عورت کی صفت کیا ہے، ناز، غمزا، شیوہ، چالا، ناز کی نرمی دل ہات پکڑنا ہنس بات بولنا، ملنا ملانا۔۔۔

اصیل عورتاں اپے مرد بغیر دوسرے مرد کو اپنا حسن دکھلانا گناہ کر جانتیاں ہیں اپنے مرد کو ہر دو جہاں میں اپنا دین ایمان کو پچھانتیاں ہیں، جوں خدا کوں مانے تیوں اپنے مرد کوں مانتیاں ہیں۔ جو مرد راضی تو خدا راضی، جو مرد راضی تو دین دنیا میں عورت۔۔۔۔ سوکن اچھے جس ٹھار، اس مروتی بی دل بیزار۔ سوکن نا مودے نا سونے دیوے، سوکن جیو پر اٹھے سوکن جیو لیوے، سوکن آتی دو کھ سے سینہ پھٹیا سوکن آئی محبت کا سوار اٹھیا۔ دائیم جھگڑتیاں جوں بلبلاں لڑتیاں ادھرتی سالے ادھرتی سالیاں چاروں طرف تی برستیاں گالیاں۔۔۔

ایکس سوں بات کیا تو جانو دسری کے جیو پر گھات کیا،
ایک نزدیک سوتی تو دسری روتی مرنے پر راضی ہوتی
کلکلاتی، تلملاتی، کیس کا کیس نہیں سنو جھگڑا کاڑتی

دنیا کے بارے میں وجہی لکھتا ہے۔

دنیا جیوں دوپہر کی چھانوں، اس دنیا کو سر ہے نا پاؤں
دنیا و دریس کی مہمان، یو تحقیق کر ہے، جاں۔۔۔
دنیا کی بڑائی کو لگن چلے گئی یو گھانس کی جھونپڑی بغیر آگ
دھوپچہ سوں جلے گی۔
کدھیں کوئی ہنستا ہے کدھیں کوئی روتا ہے یو دنیا ہے یوں ہوتا ہے

دنیا ایسی ہے جو اس دنیا خاطر لوگاں نے ماں باپ کوں مارے ہیں۔

سگے بھایاں نے سگے بھایاں سوں عداوت سارے ہیں۔
دنیاماں، دنیاباپ، دنیابھائی آخر یودنیا کسی کی ہونئیں آئی
مصلحت سوں چلتا دنیا کا کارخانہ، کیں سچا بول کیں جھوٹ ابہانہ
دلے جھوٹے کوں سب کوئی پیتا تے، سچے کی بات کوئی خاطر نہیں لیاتے"

صوفیائے کرام دل کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس کا بڑا احترام کرتے ہیں، ان کے نزدیک دل آئینہ ہے، جس میں خدائے تعالیٰ کا جلوہ نظر آیا ہے، وجہی نے دل پر اس طرح اپنے خیالات رقم کئے ہیں،

دل بہت ہے بڑا دل پر کون رہ سکتا کھڑا
جاں اسرار، جان راز کی ٹھار، اس تی پیشتر حضرت جانے ہور و پروگرام، یو بات دل کی حدتی آنگے ہے نقلی کی حدتی آنگے وجہی کے نزدیک یہی دل جیتا اس ہر دو جہاں کی منزل میں اتنا ہے سب دل ہیں۔ انا العشق کی منزل ہے، یوانا العشق کا مقام عاشق جانتا ہے عابد کوں کاں فام۔۔۔"

ڈاکٹر جاوید وشسٹ نے لکھا ہے کہ۔

"زباں و بیاں کی تازگی اور ندرت خیال نے ملا وجہی کے انشائیوں میں ایسی فسوں کاری کی ہے، ایسا جادو جگایا ہے کہ خشک سے خشک موضوع بھی گل برگ تر کی طرح نرم و نازک اور نغمہ دلربا کی طرح ہوش ربا ہے"

وجہی کے انشائیوں میں سادگی بھی ہے شگفتگی بھی، اختصار بھی ہے جامعیت بھی۔ موضوع کا تنوع بھی ہے، وسعت فکر و نظر بھی حدت طرازی بھی ہے، مسرت آفرینی بھی رنگینی بھی ہے فنکارانہ پختگی بھی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے، روانی غنائیت اور نغمگی ان انشائیوں کی جان ہے۔

6.3 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے بتائیے کہ انشائیہ اور مضمون میں کیا فرق ہے۔؟

۲۔ انشائیہ میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

۳۔ کیا انشائیہ مغرب کی دین ہے، مثال لکھئے؟

۴۔ کیا سب رس کے مضامین پر انشائیہ کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

۵۔ انشائیہ پرداز کی حیثیت سے وجہی کا مقام متعین کیجئے۔

6.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو انشائیہ کے بارے میں واقف کرایا ہے، نیز وجہی کی انشائیہ نگاری سے، اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت، اس اکائی کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ وجہی اردو کا پہلا انشائیہ نگار ہے۔ اس نے داستان کہتے کہتے داستان سے ہٹ کر مختلف موضوعات پر انشائیہ تحریر کیے ہیں۔ اس اکائی میں آپ نے معلومات کی جانچ بھی کی۔ مشکل الفاظ کے معنی بھی دیکھے توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

6.5 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پند	نصیحت	موعظت	نصیحت
شناخت	پہچان	دلائل	دلیل کی جمع، ثبوت
انبساط	خوشی	متنوع	قسم قسم کا

6.6 سفارشی کتب:

۱۔ ملا وجہی کے انشائیے — جاوید وشسٹ

۲۔ انشائیہ کی بنیاد — سلیم اختر

۳۔ خیال پارے — وزیر آغا

۴۔ انشائیہ اور انشائیے — سید محمد حسنین

ڈاکٹر لیس۔ مسعود سراج

پروفیسر، صدر، شعبہء اُردو

میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۷) سب رس بہ حیثیت تمثیل

ساخت:

7.0 اغراض ومقاصد

7.1 تمہید

7.2 تمثیل نگاری

7.2.1 تمثیل کی اقسام

7.2.2 سب رس بحیثیت تمثیل

7.3 نمونہ امتحانی سوالات

7.4 خلاصہ

7.5 فرہنگ

7.6 سفارشی کتب

7.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے

☆ تمثیل نگاری

☆ تمثیل کی اقسام اور

☆ سب رس کا بحیثیت جائزہ لے سکیں، انہیں اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

7.1 تمہید

اس اکائی میں تمثیل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور سب رس کی تمثیل نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ تمثیل **Allegory** کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ عشق مجازی کی بھی اچھی تمثیل ہے اور عشق حقیقی کی بھی۔

7.2 تمثیل نگاری:

تمثیل کے معنی ہیں مثال، تشبیہ، نظیر، مشابہت، اگر چہ یہ نقل ڈرامے کے لئے بھی ایک عرصے تک استعمال کیا گیا ہے، لیکن الیگری کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ Allegory اک یونانی لفظ ہے، جو Allos بمعنی دوسرا اور Agoreuein بمعنی بولنا سے بنا ہے، یعنی اس سے یہ مفہوم لیا جاسکتا ہے کہ ایک بات کہی جائے اور دوسری بات مراد لی جائے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ الیگری کا ترجمہ ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے رمزیہ کیا ہے۔ سید مسعود حسن رضوی نے مرادیہ، ڈاکٹر عزیز احمد نے مثالیہ اور اسلوب احمد انصاری نے مجازیہ کیا ہے ان تمام میں تمثیل کی اصطلاح الیگری کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ رمزیہ علامت نگاری کے معنوں میں بھی مستعمل ہے، نیز مرادیہ اور مجازیہ سے مفہوم کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی۔

یہ بتادینا ضروری ہے کہ تمثیل محض تجسیم (Personification) نہیں اس میں معنوی اعتبار سے دو سطحیں ہوتی ہیں، ایک خارجی یا ظاہری سطح دوسری باطنی یا داخلی سطح۔ یہاں خارجی سطح داخلی سطح سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ یہاں بات پردہ در پردہ کہی جاتی ہے۔ یہاں واقعات اور کردار دونوں متوازی سطحوں پر حرکت کرتی ہے۔ یہ سطحیں آخر تک برقرار رہتی ہیں، اور آخر میں ان کی وضاحت کردی جاتی ہے۔ یہاں جو مفہوم ظاہر میں نظر آتا ہے، وہ حقیقت میں نہیں ہوتا اس کے پیچھے ایک گہری معنویت ہوتی ہے، خارجی سطح کے نشیب و فراز داخلی سطح پر موجود سلسلہ خیال کے اتار چڑھاؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔ داخلی سطح کسی مخصوص خیال یا مقصد سے متعلق ہوتی ہے، اسی مناسبت سے خارجی سطح حرکت کرتی ہے، بقول ڈاکٹر سید حامد حسن۔

"رمزیہ (تمثیل نگاری) ایک قسم کی علامتی تحریر ہے جس میں کردار، واقعات اور ان سے مرتب ہونے والا انجام اپنے انفرادی، اور مجموعی عمل سے کسی اور تصور کی نمائندگی کرتے ہیں"۔

تمثیل ایک خاص طرز اظہار کا نام ہے، اس میں غیر مرئی اور مرئی اور مرئی کو غیر مرئی بنا کر پیش کیا جاتا ہے، یعنی اس میں جذبات اور اوصاف اور مجرد اشیا کو مجسم کر کے واقعات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تمثیل میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے، اس کا زیادہ تر مقصد اخلاقی اور اصلاحی ہوتا ہے۔ تمثیل نگاری نہ کسی خاص صنف سے مخصوص ہے اور نہ ہی کسی اسلوب سے۔ ادب کی کسی بھی صنف میں ہوسکتی ہے اور طرزِ تحریر

سادہ بھی ہوسکتا ہے، مسجّع اور مقفیٰ بھی یعنی نظم بھی تمثیلی ہوسکتی ہے، ڈراما اور داستان بھی۔ تمثیل مثنوی میں ہوسکتی ہے، انشائیہ میں بھی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی تمثیل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر مری خیال کو مری سے اور غیر ناطق کو ناطق تصور کرلیا جاتا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایسی چیزوں کا ذکر افسانوی انداز میں کیا جاتا ہے، تیسری اہم خصوصیت رمزیہ کی یہ ہے کہ اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے"۔

تمثیل دقیق سے دقیق مسائل کو دلکش اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں۔

"بیشتر تمثیلی تحریریں مجرد تصور و اوصاف کی تجسیم کرتی ہیں، چونکہ ذہن انسانی کو مجرد تصورات بالخصوص اخلاقی تصورات کو گرفت کرنا مرغوب نہیں اس لیے انہیں مجسم کرکے، افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا تا کہ قارئین دلچسپی سے پڑھیں۔

یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن عام طور پر تصورات اور مجردات کو آسانی سے اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا۔ انہیں مجسم اور متشکل کرکے افسانوی روپ میں پیش کیا جائے تا کہ وذہن اس کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

7.2.1 تمثیل کی اقسام

موضوع اور مواد کے اعتبار سے تمثیل نگاری کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،

۱۔ اخلاقی تمثیل نگاری: اس کا مقصد کسی اخلاقی پہلو کی طرف توجہ دلانا یا کسی مذہبی مسئلے کی تفہیم کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ علمی تمثیل: یہ کسی فکری یا علمی نکتے کو نمایاں کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے۔

۳۔ سیاسی اور سماجی تمثیل: اس میں سیاسی و سماجی مسائل کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔

۴۔ طنزیہ تمثیل: ایسی تمثیل جس میں طنز کے ذریعے اصل واقعات کو ایک مفروضے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

7.2.2 سب رس بحیثیت تمثیل

آیئے اب وجہی کی اہم تمثیل سب رس کا جائزہ لیں آپ تو یہ جانتے ہیں کہ وجہی نے سب رس میں حسن و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے، سب رس کو اس کے مثالیہ قصے،

متصوفانہ معنونیت اور رنگین اسلوب نگارش نے ایک سدا بہار کارنامہ بنادیا ہے۔ سب رس عشق مجازی کی بھی اچھی تمثیل ہے اور عشق حقیقی کی بھی متصوفانہ قصے میں جہاں وجہی نے دنیا کی روزمرہ زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، فطرت انسانی کی نیرنگیوں کی تصویر کشی کی ہے وہیں ماحول کی عکاسی بھی کی ہے، اور اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس نے عشق کی واردات کو بہتر طور پر پیش کیا ہے، اور تصوف کے مختلف مراحل کی تفہیم بھی اچھی طرح کی ہے، سب رس میں بیان بیک وقت دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ ایک ظاہری سطح یا خارجی سطح جس کے ذریعے عام قاری کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ اس میں عشق مجازی کے بیان سے دلچسپی پیدا کی گئی ہے، دوسری زیریں سطح یا باطنی سطح جس میں تصوف کے مختلف مقامات کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے ظاہری کردار بھی باطنی کرداروں کے صفات کے اعتبار سے حرکت کرتے ہیں۔ قصہ ایک معنوی گہرائی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

وجہی نے مختلف غیر مرئی خیالات، جذبات اور ذہنی کیفیات کو مجسم اور متشکل کردیا ہے۔ ان کو انسانی روپ میں پیش کیا ہے، اس کے ظاہری کردار باطنی کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

آپ نے پچھلی اکائی میں پڑھا ہے کہ وجہی نے عشق کو مشرق کا اور عقل کو مغرب کا بادشاہ بنا کر پیش کیا ہے اس طرح اس نے مجرد خیال کو مجسم کردیا ہے۔ اگرچہ عقل و عشق میں تضاد ہے پھر بھی دونوں میں ایک تعلق بھی ہے۔ عقل کے بیٹے کا نام دل ہے۔ دل تن کی مملکت کا مالک ہے، حسن عشق کی بیٹی ہے۔ دل حسن پر دل سے فدا ہے۔ دل کا حسن پر فدا ہوجانا ایک فطری بات ہے۔ دل کا منبع عشق ہے۔ حسن کو پانے کے لیے عاشق کو مختلف مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ پر بخوبی واضح ہوجائے تا کہ حقیقی اعتبار سے بھی سلوک و معرفت کی راہیں بڑی کٹھن ہیں۔ یہاں بڑی دشوار گذار مراحل آتے ہیں، عقل بادشاہ مصلحت سے کام لیتا ہے۔ وہ دل کی پاسبانی کرتی ہے۔ اس پر پہرے بٹھادیتا ہے۔ اسے قید کروادیتا ہے، اسے روکتا ہے، خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جواب

سوال ۱: تمثیل سے کیا مراد ہے، اور تمثیل میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے، اپنے الفاظ میں قلم بند کیجئے۔

سوال ۲: دل و حسن کے کردار پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: سوال ۱ 7.2 اور سوال ۲ 7.2.2 کے تحت دیکھئے۔

آپکو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ دل داستاں کا ہیرو ہے یعنی سب رس میں دل مجازی سطح پر ہیرو ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں حسن حقیقی کا مرکز ہے۔ اسی خیال کو میر درد نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، کہتے ہیں۔

؎ ارض وسما کہاں تیری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

دل باطنی سطح پر عارف ہے، جو حسن حقیقی کی تلاش میں ہے، وہ جلوہ خداوندی کی تلاش کرتا ہے، اس تلاش کا مقصد یہی ہے کہ اس کو بقا حاصل ہو جائے۔ سب رس میں آب حیات حقیقت میں بقا کی نمائندگی ہے دل جہاں کہیں حسن کو دیکھتا ہے سو جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ نظر دل کا دوست ہے وہ جاسوسی کرتا ہے، اہل نظر دل ہی کے ذریعہ مشاہدہ حسن کرتے ہیں۔ نظر دل (ہیرو) کے ایما پر آب حیات کی تلاش میں جاتا ہے، آب حیات کی تلاش میں وہ شہر عافیت کے بادشاہ ناموس سے ملتا ہے، ناموس، نظر کو بتاتا ہے کہ آب حیات ، انسان کی آبرو ہے۔ آبرو و آبحیات میں بڑی مناسبت ہے۔ نظر ناموس کی بات سے مطمئن نہیں ہوتا آب حیات کی جستجو میں آگے بڑھتا ہے۔ راستے میں اس کو ایک پہاڑ نظر آتا ہے۔ جس کا نام زہد ہے۔ واقعی زہد بھی پہاڑ کی طرح اٹل ثابت ہوتا ہے، یہاں نظر کی ملاقات زرق سے ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ آب حیات کو آنسوؤں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ آب حیات اور آنسو میں بھی ایک نسبت ہے، زرق کی باتوں سے نظر کو اطمینان نہیں ہوتا، ہے وہ آگے بڑھتا ہے۔ یہاں اس کی ملاقات بادشاہ ہمت سے ہوتی ہے۔ وہ نظر کو بتاتا ہے کہ مشرق کے ملک میں ایک بادشاہ ہے، اس کا نام ہے عشق اس کی بیٹی حسن ہے۔ وہ شہر دیدار میں رہتی ہے۔ اس کے باغ رخسار میں دہن نام کا ایک چشمہ ہے۔ اس چشمے میں آب حیات ہے۔ ہمت نظر کو سمجھاتا ہے کہ شہر دیدار تک رسائی مشکل ہے۔ یعنی دیدارِ محبوب بہت مشکل ہے، ہمت سے نظر کو معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں ایک سحر پڑتا ہے، جس کا محافظ رقیب ہے، دیدارِ حسن کی راہ میں ہمیشہ رقیب حائل ہوتا ہے، حسن، حسنِ کامل ہے، جلوہء خداوندی ہے، جس کو پانے کے لئے دل بے تاب ہے، عشق حسن کا باپ ہے یعنی نور مطلق ہے۔ صوفیہ کے نزدیک خدا عشق یا محبت ہے۔ عشق حقیقت میں اطاعت خداوندی ہے۔ جس کے بغیر حسن سے ہم آغوش ہونا ممکن نہیں۔

مجازی سطح پر عشق کے سپہ سالار مہر کی بیٹی وفا ہے، جو حسن کی راز دار ہے، وفاداری نبھاتی ہے۔ حسن کی دائی ناز ہے، جو بہت تجربہ کار ہے۔ لٹ بھی حسن کی سہیلی ہے۔ حسن نظر سے دل کی تعریف سن کر اس پر

عاشق ہوجاتی ہے، اپنے قاصد خیال کو نظر کے ہمراہ دل کے پاس بھیجتی ہے، خیال مصور ہے، وہ حسن کی تصویر بناتا ہے، جسے دیکھ کر عاشق ہوجاتا ہے، اور وہ شہر تن سے روانہ ہونے کی تیاری کرتا ہے۔ عقل وہم کے کہنے پر دل نظر اور خیال کو قید کروادیتا ہے۔ نظر انگوٹھی کی مدد سے شہر دیدار پہنچتا ہے۔ رقیب اسے قید کردیتا ہے، تولٹ اسکی مدد کرتی ہے۔ دل کو لانے کے لئے غمزہ کو نظر کے ساتھ بھیجتی ہے، عقل اور عشق کی فوجوں کے درمیاں معرکہ ہوتا ہے، عقل ہار جاتا ہے، غمزہ دل کو شہر دیدار تک پہنچاتا ہے، غیر کی بیٹی رقیب دل پر عاشق ہوجاتی ہے۔ حسن کا روپ دھار کر دل سے قربت حاصل کرتی ہے، حسن پہ منظر دیکھ کر دل کو قید کردیتی ہے۔ غیر جب اقبال جرم کردیتی ہے تو حسن دل اور غیر کو معاف کردیتی ہے۔

عقل کا سپہ سالار صبر ہے شہر ہدایت کے حاکم ہمت سے مدد طلب کرتا ہے، ہمت اپنے بھائی قامت کے مشورے سے عقل اور عشق کے درمیاں مصالحت کرادیتا ہے، عقل کو وزارت دی جاتی ہے۔ دل اور حسن کی شادی کردی جاتی ہے، پھر ایک دن حسن، دل اور نظر کی گلشن رخسار میں حضرت خضر سے ملاقات ہوتی ہے، جو اسے چشمہ آب حیات سے روشناس کراتے ہیں۔ یہاں ہر کردار اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اپنا رول نبھاتا ہے۔ عقل دل کو جذبات کی رو میں بہنے سے روکتا ہے۔ عشق عقل سے زیادہ قوی ہے، غیر اور رقیب رکاوٹ ڈالتے ہیں، ہمت شہر ہدایت کا حاکم ہے۔ ہمت ہی نظر کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ مصیبت میں کام آتا ہے۔ وہم ذہن میں، وہم ڈالتا ہے، صبر عشق کی راہ کا سنگ گراں ہے۔ وفا، وفاداری، نبھاتی ہے، ناز حسن کو غمزہ وادا سکھاتی ہے۔ وصال کا قصر، شہر دیدار، ملک تن، گلشن رخسار آب حیات یہ سارے مقامات اپنا ایک مقامات رکھتے ہیں۔ سب رس مجازی اور حقیقی دونوں سطحوں پر متحرک نظر آتی ہے، وجہی نے قصہ خاص مقصد سے ترتیب دیا ہے۔ یہ مقصد اخلاقی ہے، حسن وعشق کی کشمکش سارے قصہ پر حاوی ہے۔ اس کے کردار مرکزی خیال سے بندھے ہوئے ہیں، مجازی اور حقیقی سطح پر متوازی معنوں میں حرکت کرتے ہیں، اس اعتبار سے سب رس ایک کامیاب تمثیل ہے۔

سب رس اور دوسری تمثیلوں میں ایک امتیاز بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ یہ بھی ہے کہ ان تمثیلوں میں پنچ تنتر اور کلیہ دمنہ کے کردار حیوانات ہوتے تھے۔ ہر حیوان کسی انسانی خصوصیت یا صفت کا مظہر ہوتا تھا، اس کے بعد مثالیہ نے اور ترقی کی اور بجائے حیوانی کرداروں کے انسانی کرداروں کو مثالیہ میں استعمال کیا جانے لگا۔۔۔

اس کے برخلاف سب رس میں یہ جدت ہے کہ اس کے کردار نہ حیوان ہیں نہ انسان اور نہ ہی اس میں

تاریخ کا سہارا لیا گیا ہے، بلکہ اس کے کردار مجرو صفات ہیں جیسے حسن، عشق، دل وغیرہ ان کے ذریعے مصنف انسانی جذبات کی فلسفیانہ تاویل کرتا جاتا ہے، بظاہر ایک دلچسپ تمثیل بھی ہے۔ عشق اور عقل کی کشمکش حیات انسانی کی سب سے دلچسپ کشمکش ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ سب رس میں مصنف نے انہیں دو حریف بادشاہوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں جیت عشق کی ہوتی ہے، لیکن عقل کو پھر بھی شکست نہیں ہونے پاتی بلکہ ایک طرح سے عقل کی جیت ہوتی وہ یوں کہ عقل کا بیٹا دل، عشق کی بیٹی حسن سے شادی کر کے اسے مفتوح کر لیتا ہے"

(اردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۷۲ا - رفیعہ سلطانہ صفحہ ۲۷)

آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ سب رس میں وجہی نے تصوف کے نکات کو تمثیلی طور پر پیش کیا ہے، اس نے مجردات کو مثلاً عشق، عقل، حسن، خیال وغیرہ کو اور موجودات کو جیسے دل، لٹ وغیرہ کو مشکل کر کے انہیں انسانی روپ میں پیش کیا ہے، اس اعتبار سے سب رس دوسری تمثیلوں سے الگ اور مختلف ہی نہیں ممتاز بھی ہے۔

7.3 نمونہ امتحانی سوالات:

ا۔ تمثیل سے کیا مراد ہے؟ ایک اچھی تمثیل میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟ تفصیل سے لکھئے۔

۲۔ اس قول کی وضاحت کیجئے کہ "سب رس عشق مجازی کی تمثیل ہے اور عشق حقیقی کی بھی"۔

۳۔ دل وحسن کے کردار پر روشنی ڈالیئے۔

۴۔ سب رس دوسری تمثیلوں سے کیوں الگ اور ممتاز ہے۔

7.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو تمثیل نگاری سے واقف کرایا ہے، اور سب رس کا بحیثیت تمثیل جائزہ لیا ہے، اغراض ومقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ سب رس ایک بہترین تمثیل ہے، اس میں قصہ مجازی اور حقیقی دونوں سطحوں پر برابر حرکت کرتا ہے، آپ نے اس اکائی میں اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات اور مشکل الفاظ

کے معنے بھی دیے گئے ہیں توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

7.5 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
گرفت کر	پکڑ، قبضہ	مجرّد	Abstract
مستعمل	مروّج	نیرنگیاں	نیرنگی کی جمع عجائبات
متوازی	برابر	مرئی	دکھائی دینے والا
			محسوس ہوتے والا
غیر مرئی	نادکھائی دینے والا، غیر محسوس		

7.6 سفارشی کتب:

۱۔ اُردو تمثیل نگاری — ڈاکٹر منظر اعظمی

۲۔ اُردو نثر کا آغاز وارتقاء — ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

۳۔ سب رس کی تنقیدی تدوین — ڈاکٹر حمیرہ جلیلی

ڈاکٹر لیس۔ مسعود سراج

پروفیسر، وصدر شعبہء اُردو

میسور یونیورسٹی، میسور

اکائی (۸) اردو میں خودنوشت سوانح نگاری

مباحث:

8.0 اغراض ومقاصد

8.1 تمہید

8.2 خودنوشت سوانح نگاری

8.2.1 اردو میں خودنوشت سوانح نگاری

8.3 خلاصہ

8.4 نمونہ امتحانی سوالات

8.5 فرہنگ

8.6 سفارشی کتب

8.0. اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ خودنوشت کیا ہوتی ہے

☆ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں خودنوشت کی کیا صورتِ حال ہے

☆ اردو میں خودنوشت نگاری کا آغاز کب ہوا

☆ اردو میں خودنوشت نگاری کے ارتقاء

☆ اردو میں اہم خودنوشت نگاروں کے بارے میں بیان کر سکیں۔

8.1 تمہید

اس اکائی میں خودنوشت کیا ہوتی ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں خودنوشت نگاری پر کس قدر توجہ دی جا رہی ہے اس کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ہم نے یہ

بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں خودنوشت نگاری کا آغاز کب ہوا اس کے ارتقاء کے بارے میں بھی آپ معلومات حاصل کرسکیں گے۔ ونیز ہم یہ بھی معلوم کرائیں گے کہ اردو کی اہم خودنوشتیں کونسی ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے۔

8.2 خودنوشت سوانح نگاری

خودنوشت سوانح کے معنی اپنی حیات آپ لکھنے کے ہیں۔ خودنوشت کے مترادف انگریزی لفظ Autobiography کا استعمال سب سے پہلے ۱۸۰۹ میں Southey نے کیا۔ یہ ترکیب انگریزی لفظ Auto فرانسیسی Biographie سے مل کر آپ بیتی کسی شخص کی روداد ہے، جس کو وہ خود بیان کرتا ہے۔ چونکہ لکھنے والے نے اپنے بارے میں لکھا ہے، اس لئے اس میں صداقت کی ضمانت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ بیتی کے لئے بنیادی چیز سچائی ہے، اور یہی سچائی کسی بھی فرد شخصیت یا ہیرو کی واضح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ خودنوشت نگار اپنی تصویر اپنے ہاتھوں آپ تیار کرتا ہے، وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی پیکر تراشی کرتا ہے۔ ہر طرح کے کوائف، نفسیاتی الجھنوں، سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز اور اپنے خوابوں، خیالوں اور افکار و اقدار کی مرقع کشی کرتا ہے۔ خارجی دنیا کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ سیاسی اور سماجی حالات کی منظر کشی ہوتی ہے۔

خودنوشت ایک طرح انکشافِ ذات ہے، خود اپنی ذات کا انکشاف کرنے سے زیادہ مشکل اور کوئی کام نہیں اس لئے خودنوشت لکھنے کی طرف بہت کم نے توجہ دی ہے۔ خودنوشت لکھتے وقت ہر چند کہ لکھنے والے کی شخصیت محور ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے گردوپیش، حالات وحوادث اور روزمرہ کے کاروبار وغیرہ کا ذکر کرے گا جن سے اس کی شخصیت ترکیب پاتی ہے۔ خودنوشت میں لکھنے والے کی شخصیت مرکزی اور موثر کردار ادا کرتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ خودنوشت خلوصِ نیت اور دیانتداری سے لکھی گئی ہو، خودنوشت کی ایک اور خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ فن کا بھی اعلیٰ نمونہ ہو۔ ایک اچھی خودنوشت ایک اچھا ادبی کارنامہ بھی ہے۔ خودنوشت نگاری کسی کی زندگی کا خود اس کے قلم کے ذریعہ نقشہ کھینچتا ہے۔ نقشہ کشی اور منظر نگاری شعوری طور پر کی جاتی ہے، اور یہ سب فنکارانہ انداز سے ہوتی ہے، اس طرح خودنوشت نگاری ایک تخیلی اور ادبی فن ہے، سوال یہ ہے کہ خودنوشت کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں روزانہ ہونے والے واقعات اور حادثات جو ہم دیکھتے

اور محسوس کرتے ہیں، اور جن تجربوں سے گزرتے ہیں، ان کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف اپنی آواز دوسروں تک پہنچانا بلکہ اپنی ذات کو تسکین دینا بھی ہے۔ خودنوشت میں نفسیاتی تجزیہ بھی ضروری ہے ۔ تا کہ خودنوشت نگار کے حالات کی عکاسی ہو سکے۔ خودنوشت سوانح میں مصنف نہ صرف اپنا جائزہ لیتا ہے۔ بلکہ اپنے ہر عمل کی نفسیاتی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی رپورٹ تیار کرتا ہے، جس سے اس کی امیدی و نا امیدی، فخر و پشیمانی اور افسوس و سرخوشی کا پورا احاطہ ہو سکتا ہے۔ خودنوشت کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ خودنوشت نگار اپنی زندگی کے واقعات تجربات اور مشاہدات ہی بیان نہیں کرتا، بلکہ وہ جس سماج میں رہتا ہے جن حالات سے متاثر ہوتا ہے ان کو بھی بیان کر دیتا ہے۔ اس طرح خودنوشت ایک طرح کی تاریخ بھی ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی خودنوشت ہو جس میں اس دور کے حالات کا ذکر نہ ہو۔ تاریخی حالت کی عکاسی خودنوشت کا ایک اہم پہلو ہے اور تاریخ صداقت خودنوشت کا بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۱۔ خودنوشت سے کیا مراد ہے؟ لکھئے

سوال ۲۔ اچھی خودنوشت کی خصوصیات بیان کیجئے

جوابات: اور ۲ کے جواب 8.2 میں دیکھیے

8.2.1 اردو میں خودنوشت سوانح نگاری

اردو میں خودنوشت کے پیرایہ کی تحریریں انیسویں صدی میں بھی ملتی ہیں، لیکن صنف ادب کی حیثیت سے ہماری زبان میں خودنوشت کا فروغ بیسویں صدی کی دین ہے۔ ویسے دیگر زبانوں اور علاقوں میں خود نوشت کا سلسلہ بے حد قدیم ہے۔ ابن خلدون کی آپ بیتی لائق ذکر ہے۔ امیر تیمور کے ملفوظات اور ترک بابری و ترک جہانگیری سے بھی خودنوشت کی ابتدائی صورتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ فارسی کی ایک اور خودنوشت شیخ علی حزیں کی تحریر کردہ ہے۔ اردو کے مشہور شاعر میر تقی میرؔ کی خودنوشت "ذکر میر" فارسی ہی میں تحریر کردہ ہے۔ ۱۸۵۷ھ کے بعد بعض اصحاب نے اپنے تھوڑے بہت حالات قلم بند ضرور کئے، لیکن اردو میں پہلی باضابطہ خود نوشت مولانا جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجیب" ہے جس میں انہوں نے کالا پانی مین اپنی جلاوطنی کا پورا نقشہ کھینچا

ہے۔ مولانا نے اس میں اپنے حالات کے علاوہ اندومان کے باشندوں کی مختصر تاریخ، ان کے رسم ورواج رہن سہن، مذہبی عقائد، وہاں کی آب و ہوا، اور تہواروں کا بیان کیا ہے، دوسری اہم خودنوشت ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" ہے جس میں لال قلعہ کے زوال پذیر معاشرہ اور تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے کئی برسوں بعد ۱۹۱۹ء میں خواجہ حسن نظامی نے اپنی آپ بیتی لکھی۔ اس میں اس دور کے حالات وکوائف ملتے ہیں، لیکن چونکہ یہ اپنے مریدوں کے لئے لکھی گئی تھی اس لے ناصحانہ اور مبلغانہ انداز زیادہ ہے، اسی کے ساتھ اس میں ان کے ماحول کی خوبیاں اور خاصیاں واضح ہوکر سامنے آئی ہیں۔ تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ہے۔ اس میں ہر چند کے اپنے دور کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر توجہ زیادہ ہے، لیکن خاندانی اور ذاتی حالات کے بھی آگئے ہیں، "نیرنگی صحبت" کسی خاتون کی طرف سے لکھی گئی، پہلی خودنوشت ہے، انداز بیان شگفتہ ہے، اس میں اس دور کے دولت مند گھرانوں کی تہذیب وتمدن کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ اس سے اس دور کی خواتین کے مسائل اور ان کے انداز ذکر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی "اپنی نوعیت کی خودنوشت ہے، عبداللطیف بجنوری نے اپنی سیاسی زندگی کو "لطیف کی کہانی" کے بعنوان پیش کیا۔ اس خودنوشت میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تفصیل اور اس کے بعد سیاسی کشمکش کا حال ملتا ہے۔ سید رضا علی کی آپ بیتی، 'اعمال نامہ "ایک منضبط، مبسوط اور ہر لحاظ سے بھرپور اور مکمل خود نوشت ہے۔ رضا علی وکیل اور سیاستداں تھے، انہوں نے زیادہ تر سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ کہیں کہیں ادبی مباحث بھی ملتے ہیں۔ یہ خودنوشت ایک عہد کی تاریخ، اسلوب بیان اور ٹکسالی زبان نے اس کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کردیا ہے۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی خودنوشت "خون بہا' کے عنوان سے لکھی۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی شخصیت سے زیادہ زندگی اور زمانے کے حالات کو ترجیح دی ہے۔ دوست احباب کا کھل کر تذکرہ کیا ہے۔ دیوانِ سنگھ مفتون نے ناقابل فراموش لکھی۔ مفتوں، بے باک اور جرائت مند صحافی تھے۔ انہوں نے اس سوانح میں بھی جرات اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے رشوت کی گرم بازاری، پولس اور حکومت کی چیرہ دستی، دیسی ریاستوں کے اسرار مظالم سازشوں، جیل کی زندگی، اخلاقی پستی، خودغرض اور ہوس پرستی کو طشت از بام کردیا۔ یہ ایک مثالی خودنوشت ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے 'میری دنیا" لکھی، ہر چند کے طوالت کا احساس ہوتا ہے، اور واقعات بھی ادھر ادھر ہیں لیکن تخلیقی زبان اور تخلیقی اسلوب کی وجہ سے اس کی اہمیت ہے۔ پروفیسر یوسف حسین خان نے 'یادوں کی دنیا' تحریر کی۔ واقعات اور اسلوب بیان دونوں زاویوں سے یہ دلکشی رکھتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" متنازعہ فیہہ خودنوشت ہے۔ اس میں زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کی جلوہ گری ضرور ہوجاتی ہے، لیکن

واقعات نگاری پر کئی ایک کو اعتراض ہے۔ ویسے جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ جوش نے نثر میں شاعری کی ہے، ان کی شاعری کا بانکپن اور طنطنہ یہاں بھی جھلکتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے "اپنی تلاش میں" تحریر کی۔ انہوں نے اپنے عہد کے معاشرہ کی تصویر کشی ضرور کی لیکن واقعات میں ارتباط نہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے 'آپ بیتی" کے عنوان سے خودنوشت لکھی۔ یہ دراصل پون صدی کی رودادِ حیات ہے۔ انہوں نے جو بھی لکھا تفصیل سے، وضاحت اور قطعیت کے ساتھ، انہوں نے اپنی خوبیوں پر نہیں خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ زباں و بیان اور فن کے لحاظ سے یہ اردو کی چند منتخبہ خودنوشتوں میں شمار ہوتی ہے۔ 'گردِ راہ" میں اختر حسین رائے پوری نے اپنی ۷۰ سالہ زندگی کو ۲۰ ابواب میں پیش کیا ہے انہوں نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے عہد کے بارے میں دلنشین انداز میں لکھا ہے۔ 'وردِ مسعود" پروفیسر مسعود حسین خان کی خود نوشت ہے۔ بے تکلف اور دوٹوک انداز کے باعث کئی ایک کے لئے وجہ شکایت ہے لیکن مسعود صاحب جس طرح واقعات اور شخصیات نگاری سے کام لیا ہے یہ انہیں کا قصہ ہے۔ احمد سرور نے "خواب باقی ہیں" میں اپنی متنوع علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روداد پیش کی ہے، لیکن یہ خودنوشت اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے یاد رکھی جائیگی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن نے "آشرم" لکھی جو اپنے معروضی پیرائیہ بیان کے باعث ممتاز ہے۔ پروفیسر سید محمد عقیل نے "گئودھول' میں نہایت تفصیل اور احتیاط سے کام لیا ہے، اور خاص طور پر ادبی فضا اور ادیبوں اور شاعروں کے مناقشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اختر الایمان نے اس آباد خرابہ میں، میں اپنی حیات کے کئی گوشے بے نقاب کردیئے۔ ان کی صاف گوئی لائق توجہ ہے۔ صفیہ اختر نے "شورشِ دوراں" کے نام سے خودنوشت لکھی اور اس میں علی گڑھ کے کئی چہرے سامنے آئے۔ نفیس بانو شمع نے "جنت سے نکالی ہوئی حوا" لکھی۔ غرض اردو میں خودنوشتوں کا سلسلہ خوب اور طویل ہے اور اس کا مستقبل روشن؟

اپنی معلومات کی جانچ نمونہ جوابات

سوال ۳: اردو میں خودنوشت سوانح نگاری کا جائزہ لیجئے۔

سوال ۴: اردو میں چند اہم خودنوشت سوانح نگاریوں کے بارے میں اظہار خیال کیجئے

جوابات ۳: سوال ۳ اور سوال ۴ کے جوابات 8.2.1 میں دیکھیئے۔

8.3 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو بتایا کہ خودنوشت، اردو میں اگر چہ پہلے بھی تھیں لیکن اس کا باضابطہ آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ اغراض ومقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اسی اکائی کے خاکہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ہم نے آپ کو خودنوشت کیا ہے، بتلایا، خودنوشت کیسی لکھی جانی چاہیئے اور اچھی خود نوشت کی خوبیاں کیا ہوتی ہیں۔اس پر بھی روشنی ڈالی۔ اس اکائی میں آپ نے یہ بھی جانا کہ اردو میں خودنوشت نگاری کا آغاز کب ہوا۔ مختلف ادوار میں کونسی خودنوشت لکھی گئیں۔ اُن خودنوشتوں پر اختصار کے ساتھ تبصرہ بھی کیا گیا کہ خودنوشت کے خوب وخراب آپ کے ذہن میں رہیں، آپ نے اپنے معلومات کی جانچ بھی کی۔

آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں، اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی۔ سفارشی کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے کہ آپ اپنے طور پر بھی مطالعہ کرسکیں۔

8.4 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔خودنوشت کیا ہے، چند نمایاں خودنوشتوں پر روشنی ڈالیئے

۲۔اردو میں خودنوشت سوانح نگاری کا جائزہ لیجئے

۳۔آپ کی پسندیدہ چند خودنوشت سوانح کے بارے میں اظہار خیال کیجئے

8.5 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
صداقت	سچائی	کوائف	کیفیت کی جمع
مبسوط	پھیلا ہوا، کشادہ	متنازعہ فیہہ	وہ چیز جس پر جھگڑا ہو
عکاسی	تصویر کھینچنا	فروغ	رونق، روشنی
منضبط	پیوسہ کیا ہوا	چہرہ دستی	ظلم، غلبہ
ارتباط	ربط ضبط، میل ملاپ	اسرار	سر کی جمع، راز

انکشاف	اظہار	گردوپیش	اطراف واکناف
توجیح	وجہ بیان کرنا	ٹکسالی زبان	مستند زبان
ضمانت	ذمہ داری، کفالت		

8.6 سفارشی کتب

۱۔اردو میں خودنوشت سوانح نگاری	صبیحہ انور
۲۔اردو خودنوشت فن اور تجزیہ	وہاب الدین علوی

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

وظیفہ یاب پروفیسر

حیدرآباد

اکائی (۹) رشید احمد صدیقی کی حیات اور خدمات

ساخت:

9.0 اغراض ومقاصد

9.1 تمہید

9.2 رشید احمد صدیقی کی حیات

9.2.1 رشید احمد صدیقی کی خدمات

9.2.2 رشید احمد صدیقی کی چند کتابوں کا تعارف

9.3 عمومی جائزہ

9.4 خلاصہ

9.5 نمونہ امتحانی سوالات

9.6 فرہنگ

9.7 سفارشی کتب

9.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گی کہ

☆۔رشید احمد صدیقی کے حالتِ زندگی بیان کر سکیں

☆۔رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں اور

☆۔رشید احمد صدیقی کی اہم تصانیف پر تبصرہ کر سکیں۔

9.1 تمہید

اس اکائی میں رشید احمد صدیقی کی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رشید صدیقی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی آپ اس اکائی میں رشید احمد صدیقی کے فن اور اُن کی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ ہم آپ کو یہ بھی معلوم کرائیں گے کہ رشید احمد صدیقی نے کن کن موضوعات پر لکھا اور ان کے لکھنے کا انداز کیسا تھا۔ اسی کی ساتھ رشید احمد صدیقی کی اہم تصانیف کے بارے میں واقفیت حاصل کر پائیں گے۔ رشید احمد صدیقی کی چند اہم کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جائیگا۔

9.2 رشید احمد صدیقی کی حیات:

رشید احمد صدیقی 25 دسمبر 1894 کو قصبہ بیریا ضلع بلیا (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے، رشید احمد صدیقی کے والد عبدالقدیر یو پی کے اضلاع بیریا اور غازی پور وغیرہ میں سب انسپکٹر پولس رہے۔ جونپور میں وہ کوتوال شہر بھی ہوئے۔ ان کی تین لڑکیاں اور چار لڑکے تھے۔ رشید احمد صدیقی تینوں بہنوں اور ایک بھائی کے بعد اپنے والدین کی پانچویں اولاد تھے۔ رشید احمد صدیقی ابتداء سے ہی والدین کے چہیتے تھے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ بچپن میں بہت زیادہ بیمار رہتے تھے، ۔اس کے باعث ابتداء میں ان کی تعلیم پر بھی کم توجہ دی گئی۔ انہیں قصبہ کے پرائمری اسکول میں داخل کیا گیا، لیکن اپنی علالت کے باعث وہ زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکے۔ ان کی تعلیم کا باضابطہ آغاز جونپور میں ہوتا ہے، جہاں

1908 میں انہیں چوتھی جماعت میں شریک کیا گیا۔ انہوں نے جونپور میں 1914 میں انٹرینس کا امتحان کامیاب کیا۔

جونپور میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے فوری بعد رشید احمد صدیقی علی گڑھ میں داخلہ نہیں لے سکے۔ انہوں نے جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اور لگ بھگ ایک سال بعد اس کام کو چھوڑ کر انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کو اچھا ماحول ملا۔ یہاں ان کے دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان (بعد میں صدر جمہوریہ ہند ہوئے) کے علاوہ شفیق الرحمٰن قدوائی، شجاع الدین، اقبال سہیل، اور سید نور اللہ جیسے لوگ شامل تھے۔ رشید احمد صدیقی نے کالج کی غیر درسی مصروفیت میں بھی حصہ لیا جس کے سلسلے میں انہیں چٹاگانگ، کلکتہ اور رنگون وغیرہ کی سیاحت کا موقع ملا۔ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے رکن تھے، ۱۹-۱۹۱۸ء میں وہ انجمن طلبہ کے معتمد ہوئے۔ ایک عرصہ تک علی گڑھ منتھلی کے مدیر بھی رہے۔ ٹینس اور برج کے وہ مشہور کھلاڑی تھے۔ رشید احمد صدیقی نے 1919 میں بی اے اور 1921ء میں یم اے کیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد رشید احمد صدیقی مدرسہ میں اردو پڑھانے پر مامور ہوئے، اور جب کالج انٹرمیڈیٹ ہوا تو یہ 1922 میں اردو مولوی کی حیثیت سے مامور ہوئے 1926 میں کہیں ان کا استقلال عمل میں آیا۔ 1935ء میں وہ ریڈر ہوئے۔ 1954 میں پروفیسر او 1958 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جونیئر لکچرر ہونے کے ایک سال بعد 1923 میں رشید احمد صدیقی کی شادی جناب شمس الحق کی صاحبزادی جمیلہ خاتون سے ہوئی، جن کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ رشید احمد صدیقی کی صحت کبھی اطمینان بخش نہیں رہی۔ ابتداء میں انہیں گردوں کا عارضہ رہا اور انہیں گردوں کا آپریشن بھی کرانا پڑا۔ 1945 میں دوبارہ آپریشن ہوا۔ جولائی 1955 میں دو عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے پھر انہیں موتیا بند کی شکایت ہوئی۔ بعد ازاں ہرنیا نے بھی آدبوچا، چنانچہ بتدریج کمزور ہوتے گئے۔ آخر 15 جنوری 1977 کو علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۱۔ رشید احمد صدیقی کی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۲۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھئے۔

جوابات: ۱، ۲: سوال ۱، سوال ۲، کے جوابات 9.2 میں دیکھیئے۔

9.2.1 رشید احمد صدیقی کی خدمات:

جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے رشید احمد صدیقی کی زندگی کا کوئی مشن نہیں تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پیشہء مدرس مقصود بالذات نہیں تھا۔ حالت نے جو رخ اختیار کیا انہوں نے وہی راہ اپنائی۔ جون پور کے ادبی اور تہذیبی ماحول کا اُن کی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ یہاں رشید احمد صدیقی کے زمانہء طالب علمی میں شعر و ادب کا گھر گھر چرچا تھا، خاندانی شاعر ہونے پر، گھر میں مجالس کا انعقاد ہوتا۔ ان گھرانوں میں محرم میں مراثی کا چرچا رہتا۔ رشید احمد صدیقی کو اپنے گھر سے علم کی مسلسل لگن اور اخلاق و شرافت کے جوہر ملے تھے۔ انہوں نے اسپورٹس میں بھی حصہ لیا، لیکن جب علی گڑھ میں ملازمت ملی اور پھر جب لکچرر ہوئے تو ان کے ادبی جوہر کھلے۔ لکچرر شپ کے زمانہ ہی سے رشید صدیقی نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1924ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج جونپور میں بعنوان "اردو بحیثیت عالمی زبان" پر لکچر دیا اور اسی سال "زبان اردو پر سرسری نظر" کی اشاعت عمل میں آئی 1929ء میں انہوں نے رسالہ "سہیل" کا اجراء کیا۔ رشید صدیقی کو لکچرر شپ کے استقلال کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت تھی۔ انہوں نے طنزیات و مضحکات" جیسی معرکہ آراء کتاب ترتیب دی۔ ان کے استقلال کے لئے علامہ اقبال نے بھی سفارش کیتھی۔ 1926ء میں ان کا استقلال عمل میں آیا۔ طنزیات و مضحکات کی اشاعت 1935 میں عمل میں آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رشید صدیقی کی ادبی سرگرمیوں کی رفتار تیز تر تھی۔ 1940 میں ان کی ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ "خندان" شائع ہوا، اور 1941 میں مضامینِ رشید کی اشاعت عمل میں آئی۔ 1946 میں ان کے مضامین کا ایک اور مجموعہ "سہیل کی سرگزشت" شائع ہوا، 1955 ' میں جدید غزل" منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب "آشفتہ بیانی میری" آپ کے نصاب میں شامل ہے،

1958 میں شائع ہوئی۔ 1944 میں ذاکر صاحب پر رشید صدیقی کی کتاب شائع ہوئی تھی، جو ۱۹۷۳ میں ہمارے ذاکر صاحب کے عنوان سے شائع کی گئی۔ 1958 میں انہوں نے "شیخ نیازی" شائع کی، "گنج ہائے گرانمایہ (حصہ اول) کی اشاعت 1942 میں عمل میں آئی اور حصہ دوم 1961ء میں "ہم نفسانِ رفتہ" بھی اس دوران چھپی "غالب کی شخصیت اور شاعری" دہلی یونی ورسٹی میں دیا گیا نظامین خطبہ ہے، جو 1969ء میں شائع ہوا۔ اس سے قطع نظر رشید احمد صدیقی کے مضامین اور خطبات کے مجموعے بھی شائع ہوئے، ہندوستان ہی سے نہیں پاکستان سے بھی جیسے "خطبات رشید احمد صدیقی (مرتبہ لطیف الزمان خاں) سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا ارتقاء علی گڑھ میں "خطبات رشید احمد صدیقی مرتبہ: مہر الٰہی ندیم اور لطیف الزماں خاں، عزیزان ندوہ کے نام، مرتبہ فصیح احمد صدیقی ولطیف اُرسان خان، انتخابِ مضامیں رشید احمد صدیقی نقش ہائے رنگ رنگ، مرتبہ پروفیسر نظیر صدیقی، اور شیرازہء خیال، مرتبہ پروفیسر نظیر صدیقی اور رشید احمد صدیقی کے اور خطبات وغیرہ بھی شائع ہوئے۔

رشید احمد صدیقی کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں کئی انعامات اور اعزازات حاصل ہوئے، جن میں قابلِ ذکر ہیں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری کا خطاب (1963) میرا کادمی کا انعام (1968 غالب شخصیت اور شاعری پر ساہتیہ اکیڈمی کا اعزاز (1971) اردو اکادمی اتر پردیش کی طرف سے اردو کی خدمت کے صلہ میں پانچ ہزار روپے کا انعام (1973ء) جامعہ اردو علی گڑھ کی طرف سے دکتور ادب کی ڈگری (1976) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری، اپنی تصانیف کی وجہ سے رشید احمد صدیقی اُردو ادب کی تاریخ میں سدا یاد کیئے جائیں گے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۳: رشید صدیقی کی تحریر و تصنیفات کا جائزہ لیجئے۔

سوال ۴: رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھئے۔

جوابات ۳ اور ۴: سوال ۳ اور ۴ کے جوابات 9.2.1 میں دیکھئے:

9.2.2 رشید احمد صدیقی کی چند کتابوں کا تعارف

رشید احمد صدیقی نے اپنی ساری زندگی شعروادب کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ ان کی کئی کتابیں ہیں اوراہم موضوحات پرہم یہاں ان کی چند کتابوں سے آپ کا تعارف کرائیں گے۔ یہ کتابیں اردوادب میں اپنے موضوع، مواد، اوراسلوب کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

9.2.2.1 طنزیات ومضحکات:

رشید احمد صدیقی ۲۲، اکتوبر ۱۹۲۲ء کوعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے، چونکہ اس زمانے میں وہاں پی' ایچ' ڈی. کی ڈگری کے لئے تحقیق کی گنجائش نہیں تھی، اس لے بحیثیت لکچرر اُن کے تقرر کو مستقل کرنے کے لئے کسی تحقیقی کام کی ضرورت تھی، اسی لئے رشید احمد صدیقی نے "طنزیات ومضحکات" جیسے موضوع پر قلم اٹھایا۔ مشرق ومغرب میں طنز ومزاح کے موضوع پر خاطر خواہ کتابوں کا مطالعہ کر کے انہوں نے اپنے خوشگوار اسلوب میں اس کتاب میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر قبل ازیں ایسی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ یہ کتاب ہماری ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کو پیش کرنے کے کئی سال بعد 1926ء میں رشید احمد صدیقی کی لکچرر شپ کا استقلال عمل میں آیا اور 1934ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔

9.2.2.2 خنداں:

رشید احمد صدیقی، آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے مضامین اور تقاریر نشر کرنے والے مستقل افراد میں شامل تھے۔ ان کے لکچرر بننے کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا اور ایک مدت تک جاری رہا، 1940 میں رشید احمد صدیقی نے ریڈیائی تقاریر کے اپنے مجموعہ کو "خنداں" کے بعنوان کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نے شائع کی۔ ریڈیائی تقاریر کے سلسلے میں پابندیوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، رشید صدیقی نے ان کا خیال رکھنے کے باوجود اپنے طرزِ تحریر کی لذت اور چاشنی کو برقرار رکھا ہے۔ ریڈیائی

تقاریر عموماً تشنگی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ چلتی چلاتی نوعیت کی۔ رشید صدیقی کے ہاں نہ چلتا چلاتا انداز ہے اور نہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ "خنداں" میں شامل بعض تقاریر تو اُن کی منتخب تحریروں میں شمار ہوتی ہیں، جیسے امتحانات، دیہاتی ڈاکٹر، لیڈر، کانفرنس کونسل کمیٹیاں، الکشن، عدالت اور دربان وغیرہ اور ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گے۔

9.2.2.3 مضامین رشید:

"مضامین رشید" رشید صدیقی کے مضامین کا نمائندہ مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی کا فن اپنے عروج پر ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا انداز الفاظ کا الٹ پھیر اور اشعار کو نشر کرتے ہوئے ان کا دلکش استعمال کہ پڑھئے اور پڑھتے رہیئے۔ رشید صدیقی کا فن قارئین سے ایک اونچی علمی سطح اور اعلیٰ فہم کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ انشا پردازی میں کمال رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے موضوع کی قید نہیں، وہ کسی موضوع کے بغیر بھی قلم چلاتے ہیں۔ اُن کی گلفشانی قلم دیکھنی ہو تو، مضامین رشید پڑھیئے، اس طرح جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے مضامین رشید کے مضامین اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس مجموعہ کے مضامین، مرشد، شیطان کی آنت، پاسبان، ارہر کا کھیت، گواہ اور گھاگھ غیر معمولی ہیں کہ پڑھتے ہوئے قاری کی نظر ٹھہر ٹھہر جاتی ہے۔

9.2.2.4 گنج ہائے گرانمایہ:

رشید احمد صدیقی کو مرقع نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ کسی کی شخصیت نگاری نہایت گہرائی اور باریک بینی سے کرتے ہیں اور اتنی قدرت کے ساتھ متعلقہ شخصیت ہمارے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے متعلقہ شخصیت کی دنیاوی مرتبت سے واسطہ نہیں رکھا بلکہ اس کے کردار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے مرقعے اعلیٰ کرداروں اور اعلیٰ شخصیات کی تصویریں بن جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے کالج کے چپراسی کندن کا مرقع بھی لکھا، ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی جو کبھی صدر جمہوریہ ہند رہے انہوں

نے شیخ نیازی کی کمسنی کی دور کے مرقع نگاری بھی کی۔ مولانا محمد علی مختار احمد انصاری، اصغر گونڈوی، علامہ اقبال، احسن مارہروی اور سید سجاد حیدر یلدرم، پر ان کے مرقعے خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید صدیقی کے مرقعوں کا مجموعہ " گنج ہائے گرانمایہ " دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک اور مجموعہ ہم نفسان رفتہ بھی ہے اور ذاکر صاحب کے بارے میں انہوں نے اپنے مرقعوں کو کتابی صورت میں ہمارے ڈاکٹر صاحب کے بعنوان شائع کیا ہے۔

9.2.2.5 غالب: شخصیت اور شاعری:

رشید احمد صدیقی نے نظامین اردو خطبات دہلی یونیورسٹی کے تحت یہ خطبہ دیا تھا، جس کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کا اس دور کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں جائزہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ قول مشہور ہے کہ مغل سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں، اردو، تاج محل اور غالب، ۔ یہ ایک خوبصورت تاثر سہی، لیکن ایک زاویہ سے یہ بات ہے بھی۔ اس خطبہ مین رشید صدیقی نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور ذوق و ذہن کے اعتبار سے ان کی منفرد حیثیت کو اجاگر کیا ہے۔ غالب کے مزاج ان کی خاندانی روایات، ان کے عوام اور دربار سے مراسم دوست و احباب سے ان کی آویزشیں، ان کے شعری کارناموں ان کی انانیت، ان کے اسلوب اور ڈکشن پر اپنے زاویہ سے عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مختصر یہ کہ "غالب و شخصیت اور شاعری" غالبیات میں ایک اضافہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۱: رشید احمد صدیقی، کی تصانیف پر روشنی ڈالئے

سوال ۲: رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات پر ایک مضمون لکھئے۔

جوابات: سوال ۱ اور سوال ۲ کے جوابات: 9.2.2 میں دیکھیئے۔

9.3 عمومی جائزہ:

رشید احمد صدیقی ۲۵ دسمبر کو قصبہ بَیریا ضلع بلیا، اتر پردیش میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پہلے قصبہ ء میں اور پھر جون پور میں ہوئی۔ ان کی صحت بچپن میں ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کلرکی سے کیا۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں داخل ہوئے ان کے دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور اقبال سہیل جیسے احباب تھے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے رکن ہونے کی وجہ سے انہیں چٹا کانگ، اور کلکتہ وغیرہ جانے کا موقع ملا۔ انہوں نے 1931 میں یم' اے کیا اور پھر یونیورسٹی میں جو اس وقت ایم اے او کالج تھا وہاں ملازم ہوئے۔ 1935 میں ریڈر اور 1954 میں پروفیسر ہوئے۔ 1923 میں رشید احمد صدیقی کی شادی ہوئی۔ ان کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئے، رشید صدیقی کی طبیعت ہمیشہ ٹھیک نہیں رہتی تھی، وہ گردوں اور قلب کے عارضوں کے شکار رہے۔ ۱۵ جنوری 1977ء کو علی گڑھ میں ان کا انتقال ہوا۔

رشید صدیقی کے وطن جونپور کا ماحول علمی ادبی تھا۔ رشید صدیقی کو ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا، لکچرر ہوائے تو ان کے جوہر اور کھلے۔ 1929ء میں انہوں نے ماہنامہ "سہیل" کا اجراء کیا۔ ملازمت کے استقلال کے لئے انہیں تحقیقی کام کی ضرورت تھی، رشید صدیقی نے "طنزیات و مضحکات" جیسی کتاب لکھی۔ انہوں نے کئی کتابیں شائع کی ہیں، جیسے "خنداں" مضامین، رشید "سہیل کی سرگزشت" آشفتہ بیانی میری اور ہمارے ذاکر صاحب وغیرہ ان کی چھوٹی بڑی اور کتابیں بھی ہیں۔ گنج ہائے گرانمایہ، (دو حصوں) میں ہم نفسان رفتہ، ہمارے ذاکر صاحب اور شیخ نیازی ان کے مرقعوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے خطبات وغیرہ کے مجموعے اور مضامین کے انتخابات بھی شائع ہوئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کو کئی اعزازات ملے، جن میں قابلِ ذکر پدم شری کا اعزاز ہے۔ اردو اکادمی اتر پردیش نے انعام سے نوازا، ساہتیہ اکیدمی نے ایوارڈ دیا۔ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی، اور جامعہ اردو علی گڑھ، "دکتورِ ادب" سے نوازا۔

رشید احمد صدیقی کی کتابیں کئی ہیں، اور ہر کتاب اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ رشید صدیقی دراصل

منفرد انشا پرداز ہیں۔ ان کی کتابوں کا اسی زاویہ سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ طنزیات ومضحکات، وہ کتاب ہے جو انہوں نے اپنی لکچرر شپ کو مستقل بنانے کے لئے تحقیقی کام کے طور پر لکھی انہوں نے اس کتاب میں طنز ومزاح کا انتہائی گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اردو میں اپنے موضوع پر یہ کتاب اہم ہے۔ "خنداں" رشید احمد صدیقی کے ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ریڈیائی تقاریر میں بعض پابندیوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اس کا خیال رکھنے کے باوجود اپنے طرزِ تحریر کی ندرت اور چاشنی کو برقرار رکھا ہے۔ ریڈیائی تقاریر عموماً چلتی چلائی اور تشنگی لے ہوتی ہیں، لیکن رشید صدیقی کے یہاں ایسا نہیں ہے۔

مضامین رشید، رشید احمد صدیقی کے منتخبہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا انداز الفاظ کا اُلٹ پھیر اور اشعار کو نثر کرتے ہوئے ان کا دلکش استعمال کہ پڑھئے اور پڑھتے رہیئے۔ رشید صدیقی انشاد پروازی میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کے لئے موضوع کی قید نہیں، وہ کسی موضوع کے بغیر بھی قلم چلاتے ہیں۔ ان کی گل افشائی گفتار دیکھنی ہو تو مضامین رشید پڑھیئے، " گنج ہائے گرانمایہ "رشید احمد صدیقی کے مرقعوں کا مجموعہ ہے، رشید احمد صدیقی مرقع نگاری اس طرح کرتے ہیں کہ شخصیات ہمارے سامنے چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہیں، انہوں نے مرقعے لکھتے ہوئے شخصیات کی دنیاوی مرتبت کو نہیں ان کے کردار کو ملحوظ رکھا ہے، انہوں نے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر حسین خان کا مرقع بھی لکھا ہے، اپنے دفتر کے چپراسی کندن کا بھی۔ ان کے مرقعے واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی ایک اہم کتاب غالب: شخصیت اور شاعری ہے، انہوں نے غالب کے فن اور ان کی شخصیت کا اس دور کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں جائزہ لیا ہے، اور ذوق وزہن کے اعتبار سے غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا یہ قول مشہور ہے کہ " مغل سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں، اردو، تاج محل، اور غالب"۔ غالب کی خاندانی روایات، ان کے عوام اور دربار سے مراسم، دوست احباب سے ان کی آویزشوں ، ان کی انانیت، ان کے شعری کارناموں ان کے اسلوب اور ان کے ڈکشن کا یہ عمدہ جائزہ ہے۔ یہی حال رشید احمد صدیقی کی اور تصانیف کا بھی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ نمونہ جوابات

سوال ۳: رشید احمد صدیقی کے بارے میں کیا جانتے ہیں لکھئے۔

سوال ۴: رشید احمد صدیقی کی چند تصانیف کا تعارف کرائیے

جواب: ۳ اور ۴ 9.3 میں دیکھئے

9.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو رشید صدیقی کی زندگی کے اہم حالات سے واقف کرایا۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکہ کے سلسلہ میں معلومات حاصل کیں۔ رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی۔ رشید صاحب کی ادبی خدمات سے بھی آپ روشناس ہوئے اور آپ نے یہ جانا کہ رشید احمد صدیقی نے لکھنے پر کیسے توجہ دی اور ان کے لکھنے کا انداز ہ کیا ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی ریڈ ہائی مضامین بھی سب سے زیادہ لکھے۔ آپ کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ رشید احمد صدیقی کا طرزِ تحریری کیا ہے، اور وہ کس خوبی سے قلم چلاتے ہیں۔ ہم نے رشید صدیقی کی کئی تصانیف کا ذکر کیا لیکن، خاص طور پر ان کی چند کتابوں کا خصوصی طور پر تعارف کرایا گیا، تا کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ رشید صدیقی کے اہم موضوعات کیا ہیں۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، اور "فرہنگ" کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی، ہم نے آپ کے مزید مطالعے کے لئے سفارشی کتب بھی دی ہیں۔

9.5 نمونہ امتحانی سوالات:

سوال ۱: رشید احمد صدیقی کی حیات پر نوٹ لکھیے۔

سوال ۲: رشید احمد صدیقی کی چند اہم کتابوں کا تعارف کرائیے۔

سوال ۳: رشید احمد صدیقی کی حیات و خدمات پر تبصرہ کیجئے۔

9.6 فرہنگ:

لفظ	معنی	لفظ	معنی
علالت	بیماری	مامور	فائز
سبکدوش	جس پر کوئی بوجھ نہ ہو، بے تعلق		
عارضہ	بیماری	فہم	غفل
رفقاء	رفیق کی جمع، ساتھی	مقصود بالذات	وہ چیز جو اصلی مقصود ہے
معرکہ اکراء	جنگ کی رونق بڑھانے والا	صلہ	بدلہ، معاوضہ
تحریرات	پابندیاں	بذرت	انوکھا پن

9.7 سفارشی کتب:

رشید احمد صدیقی، آثار و اقدار (مرتبہ) اصغر عباس

رشید احمد صدیقی، افکار و گفتار، (مرتبہ) مالک رام

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

وظیفہ یاب پروفیسر

حیدرآباد

اکائی (۱۰) رشید احمد صدیقی کا اسلوب

ساخت:

10.0 اغراض ومقاصد

10.1 تمہید

10.2 اسلوب کی ماہئیت اور حقیقت

10.2.1 اردو نثر کے صاحبانِ اسلوب

10.2.2 رشید احمد صدیقی کا اسلوب

10.3 عمومی جائزہ

10.4 خلاصہ

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.6 فرہنگ

10.7 سفارشی کتب

10.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆۔ اسلوب کی ماہئیت اور حقیقت کے بارے میں جان سکیں

☆۔ اردو نثر کے صاحبانِ اسلوب کا تعارف کرا سکیں اور

☆۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب سے واقفیت حاصل کر سکیں اور اسے اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں۔

10.1 تمہید:

اس اکائی میں اسلوب کی ماہئیت اور اس کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہوگا

کہ مختلف زبانوں کے ادب میں اسلوب کا مفہوم کیا ہے، اور اسلوب میں شخصیت کا عمل دخل کس قدر ہوسکتا ہے کہ اسلوب اور کچھ نہیں بجائے خود شخصیت ہوتا ہے، آپ وہ بھی جان پائیں گے کہ اردو نثر میں صاحبِ اسلوب ادیب کون کون گزرے ہیں، اور ان کے اسلوب کی کیا خصوصیات ہیں، رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی خصوصیت کیا ہے اور اسلوب کی وجہ سے ان کی تحریروں میں شگفتگی اور رنگینی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ آپ رشید احمد صدیقی کے اسلوب کے اقتباسات سے بھی محظوظ ہوں گے۔

10.2 اسلوب کی ماہیت اور حقیقت

اسلوب کی تعریف بظاہر جتنی آسان معلوم ہوتی ہے اسقدر آسان نہیں ہے، اسلوب کو انگریزی میں Style اور لاطینی میں STILUS کہا جاتا ہے۔ کلاسیکی لاطینی میں اسلوب ابتداء طرزِ تحریر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ بعد ازاں تحریر و تقریر میں اپنی شخصیت کے اظہار کا نام اسلوب قرار پایا۔ فرانسیسی میں اسلوب اپنے آپ کے بہترین اظہار کے معنوں میں رائج ہے۔ یعنی اسلوب لکھنے والے کی شخصیت کے اظہار کا نام ہے، ٹینی سن (Tennyson) نے کہا ہے کہ قابلِ توجہ بات یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں۔ یا جس طرح سوئفٹ نے اسلوب کی تعریف کی ہے کہ اسلوب نام ہے، مخصوص الفاظ مخصوص ترتیب کے ساتھ۔ اسلوب تو وہ ہے جس کو نفسِ مضمون سے جدا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلوب بجائے خود شخصیت ہے۔ اسلوب صرف طرزِ تحریر سے نہیں مصنف کے انفرادی فکر اور زاویہ نظر سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ ایک مخصوص اور منفرد اصطلاح ہے۔ اسلوب میں مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے، کارلائل نے کہا ہے کہ اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں کہ جب چاہا اتارا اور جب چاہا پہن لیا۔ یہ انسان کی جلد ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس کو پڑھ کر ہم کہتے ہیں کہ یہ میرؔ کا طرز ہے۔ یہ محمد حسین آزاد کا رنگ ہے یا یہ ابوالکلام ہیں۔ دراصل یہی شخصیت اور یہی اسلوب ہے جو اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ اسلوب اور شخصیت کے اس گہرے ارتباط کا مطلب یہ ہوا کہ اسلوب محض شاعرانہ اظہارِ خیال، الفاظ کی ایک مخصوص ترتیب اور حسنِ بیان کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اسلوب اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب

کسی کے پاس کہنے کے لئے کوئی چیز خاص چیز ہو چنانچہ اسلوب کے لئے پہلے مصنف کے خیالات اور اس کے زاویہ نظر، غور کرنا چاہیئے، انشا پرداری کا مسئلہ اس کے بعد آتا ہے، لیکن اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نہ تو محض خیال سے اسلوب پیدا ہوتا ہے، اور نہ محض انشا پردازی سے۔ تاہم فکر کی انفرادیت، اندازِ بیان کو نکھار اور سنوار دیتی ہے، چنانچہ اگر کسی کے پاس سوچنے کے لئے کچھ نہ ہو اور اس کا اندازِ فکر نہ ہو تو اس کا اسلوب بھی ممکن نہیں۔ ہولنگ ورتھ لکھتا ہے، "اسلوب جسم اور فکر روح ہے۔ روح کی طرح فکر بھی اپنے جسم (اسلوب) سے خود کو ظاہر کرتی ہے"۔ مختصر یہ کہ اسلوب وہ ہے جس سے مصنف کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ کیا اور کیسی ہے، اور جو اپنی تحریر میں اپنی شخصیت کو ظاہر کر پاتے ہیں، وہی صاحبِ اسلوب ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۱: اسلوب کی تعریف کیجئے۔

سوال ۲: اسلوب کی ماہیت اور حقیقت پر ایک مضمون لکھیئے۔

جوابات ۱ اور ۲: سوال ۱ اور ۲ کے جوابات 10.2 میں دیکھئے۔

10.2.1 اردو نثر کے صاحبانِ اسلوب:

اردو شاعری میں میر، غالب اور مومن وغیرہ اپنے اسلوب کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم اردو نثر میں غالب اور سرسید کو اولین صاحبانِ اسلوب قرار دے سکتے ہیں۔ غالب نے اگرچہ مقفع، مرصع اور مجع نثر بھی لکھی ہے لیکن ہماری نظروں میں ان کا مقام ان کے مکاتیب سے ہے۔ یہ مکاتیب محض اس لئے اہمیت نہیں رکھتے کہ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا، کیونکہ یہ مکاتیب غالب کا حسن ہے مگر ظاہری۔ مکاتیب غالب کی حقیقی خوبی یہ ہے کہ ان سے غالب کی شخصیت کے تمام خارجی اور داخلی پہلو اپنے معائب اور محاسن کے ساتھ منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ اور بیک نظر ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو غالب کی تحریر ہے۔ غالب کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو صرف ان کے مکاتیب کے ذریعہ بھی ضبطِ تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔

مکاتیبِ غالب کا یہی بانکپن بے مثال ہے اور اسلوب کا تقاضہ بھی، سرسید کا اسلوب متنوع ہے۔ انہوں نے طرح طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، اور ہر موضوع سے انصاف کیا ہے، سرسید کے اسلوب کی خصوصیت سادگی ہے۔ سرسید کے بعد حالی، آزاد، شبلی، اور نذیر احمد قابلِ ذکر ہیں۔ حالی کا اسلوب سادہ جامع اور وقیع ہے۔ حالی نے اردو نثر کو سنجیدگی اور متانت سے روشناس کرایا، شبلی اپنی علمیت اور شعریت کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے جتنی بلند مرتبت بات کہی اس کے لئے اتنا ہی خوبصورت اور رنگین اسلوب اختیار کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کی ٹھیٹ ٹکسالی زبان کو اختیار کرتے ہوئے ایک خاص اسلوب کو اردو ادب سے روشناس کرایا۔ انہی کے ساتھ ان کا یہ اسلوب بھی ختم ہو گیا۔ محمد حسین آزاد، باغ و بہار قسم کے آدمی تھے، ان کے اسلوب میں ایک سرشاری اور بہار کی سی کیفیت ملتی ہے۔ آزاد کے اسلوب کے بارے میں شبلی کا یہ جملہ اہمیت رکھتا ہے، کہ "اگر یہ شخص گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اُردو کی دیو پیکر شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے کئی موضوعات پر قلم اٹھایا، لیکن اپنے اسلوب کے وزن و قار اور موضوع کی آب و تاب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سرسید اور ابوالکلام کے بعد کی کڑی ذاکر حسین ہیں۔ ذاکر صاحب نے کمیت کے اعتبار سے کم لکھا ہے، لیکن کیفیت کے اعتبار سے نہیں۔ انہوں نے عام موضوعات پر قلم نہیں اٹھایا۔ وہ ایک ماہر تعلیم اور ماہر معاشیات تھے۔ ذاکر صاحب کا اسلوب تاثراتی ہے، جس میں ان کے دل کی دھڑکنوں کو سنا اور گنا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر سادہ ہوتی ہے، لیکن جامع اور پر اثر جس سے ان کے بے پناہ مطالعہ اور سلجھی ہوئی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ تعلیمی، معاشی اور تہذیبی مسائل کو ذاکر صاحب نے جس سادگی خوبی اور وضاحت سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۳: اردو نثر کے چند صاحبِ اسلوب قلم کاروں کے بارے میں لکھئے۔

سوال ۴: چند قدیم صاحبِ اسلوب نثر نگاروں کے بارے میں اپنی معلومات پیش کیجئے۔

جوابات ۳ اور ۴، سوال ۳ اور ۴ کے جوابات 10.2.1 میں دیکھئے۔

10.2.2 رشید احمد صدیقی کا اسلوب

رشید احمد صدیقی صاحبِ اسلوب ہیں، اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ لیکن اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کہ انہوں نے ہمارے دیگر صاحب، انشاء پردازوں کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی تحریروں میں کسی شاہ نذیر غازی پوری کے خوبصورت طنزیہ سے فقروں کو بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقروں کو سراہا ہے۔ یہ اوصاف رشید احمد صدیقی کے پاس بھی ہیں اور کئی عجیب نہیں وہ شاہ نذیر غازی پوری سے اس خصوصی میں متاثر ہوئے ہوں۔ مولانا آزاد کی طرح رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں بھی تنوع ہے اس کے علاوہ ان کے ہاں سرسید، شبلی، سجاد انصاری، اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے اسالیب کی جھلکیاں ملتی ہیں، اس کے باوجود ان کا اسلوب ان کا اپنا ہے، جس کی تقلید کی کوشش تو کی گئی لیکن پوری کامیابی کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ رشید احمد صدیقی کا اسلوب ان کی شخصیت ہے۔ رشید احمد صدیقی نے خواہ تنقید کی ہو خواہ مرقع نگاری یا طنز و مزاح یا تہذیبی مضامین لکھے ہوں ہر جگہ ان کے اسلوب کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ غزل کے بارے میں مختلف ادیبوں نے اظہارِ خیال کیا لیکن، رشید احمد صدیقی نے انوکھے زاویے پر غزل کی اہمیت اور اس کی امتیازی حیثیت پر زور دیا ہے۔ یہاں دیکھیے اپنے انداز میں وہ غزل کے بارے میں کتنی عمدہ بات اور کتنی عمدگی سے کہہ جاتے ہیں۔

"غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں، ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و قار ایک دوسرے سے ملا ہے۔"

غزل فن نہیں فسوں بھی ہے، شاعری نہیں تہذیب بھی۔ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی ہے، کبھی کبھی تنقیح و تزکیہ بھی "(جدید غزل صفحہ ۱۲)

دلنوازی اور چاشنی رشید احمد صدیقی کے اسلوب کے خصوصی اوصاف ہیں، جو اور نقادوں کے ہاں شاید ہی ملیں وہ اپنی تحریر میں الفاظ اور تراکیب کا استعمال کچھ ایسے غیر متوقع طور پر کرتے ہیں کہ قاری چونک جاتا ہے، حسرت موہانی کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"حسرت کا عشق، حسرت کی زبان، حسرت کا لہجہ، حسرت کی شاعری کی ساخت پرداخت سب کی سب مفرد ہے، مرکب نہیں۔ وہ جڑی بوٹی کے قائل ہیں، ماء اللحم و کشتہ جات کے نہیں" (جدید غزل صفحہ (65)۔

رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا اندازہ کچھ ان کی مرقع نگاری سے لگایا جاسکتا ہے۔ مرقع نگاری میں الفاظ کی ترتیب، جملوں کی ترش خراش، روانی اور بہاؤ، سب نے مل کر ان کے اسلوب کو گراں بہا بنادیا ہے۔ جذبات اور تخیل کی رنگا رنگی اپنی جگہ، مولانا محمد علی جامع شخصیت کے مالک تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

'محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ ہماری زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں، کتنے چشمے ابل رہے ہیں، کتنے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دار و رسن کی طلب گار ہیں، یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہی نہیں بتایا، بلکہ وہ آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔ مرد غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہمی و طرب انگیزی برکتوں کی عافیت، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندزاہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرہ سے، ڈوبتے ہوئی سورج سے" (گنجہائے گرانمایہ:۲،۳)

اس کی وضاحت ضروری ہے، رشید صدیقی کی تحریروں میں صنعتِ تجنیس کا استعمال بہت زیادہ ے۔ وہ غیر معمولی فنکارانہ انداز میں اس صنعت کا استعمال کرتے ہیں، اس طرح مزاح ہی نہیں ان کے ہاں ایک خاص اسلوب کی چاشنی بھی ملتی ہے، یہاں اس رنگ کے چند فقرے،

"غالب کے تصرف سے غزل اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی" (جدید غزل ۶۱)

"تھوڑی دیر کے لئے بھول جایئے کہ دنیا میں بیوی یا بے روزگاری بھی کوئی چیز ہے" (خنداں 55)

"مرد اپنی شرافت کا اتنا قائل نہیں جتنا عورت کے شباب کا" (بیوی سے متعلق،)

اور پھر عام انداز کے فقرے بھی۔ جو رشید صدیقی کے اسلوب کی پہچان ہیں۔ انہوں نے ہر نوع کے

مضامین میں اپنے قلم سے جادو جگا دیا ہے۔ یہاں ایسے ہی چند اور فقرے کے ان کے اسلوب کی دلداری کا اندازہ ہو:

"شاعری دنیا کی مادری زبان ہے" (جدید غزل)

"انسان کی ناگہانی موت، فطرت کا سب سے بزدلانہ انتقام ہے" (علیگڑھ میگزین)

"ماضی قوم کا حافظہ ہے جس کے بغیر شعور کا وہ تسلسل باقی نہیں رہتا، جس سے سوسائٹی یا قوم کی شیرازہ بندی ہوتی ہے" (آشفتہ بیانی میری)

"شاعری زیور کی محتاج ہے، اور زیور غزل کی محتاج ہے" (جدید غزل)

"حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر قرار دیئے جاسکتے ہیں": (طنزیات و مضحکات)

غرض رشید صدیقی صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں اور اردو ادب کی آبرو۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۱: تفصیل سے لکھئے کے رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟

سوال ۲: رشید احمد صدیقی کے اسلوب پر روشنی ڈالئے۔

جوابات سوال ۱ اور سوال ۲ کے جوابات: 10.2.2 میں دیکھئے۔

10.3 عمومی جائزہ:

اسلوب لکھنے والے کی شخصیت کے اظہار کا نام ہے۔ ٹینی سن نے طرزِ اظہار کو اسلوب کہا ہے تو سوئفٹ کے نزدیک اسلوب، مخصوص الفاظ کی مخصوص ترتیب کا نام ہے، اسلوب میں الفاظ کی اہمیت تسلیم لیکن اسلوب صرف الفاظ کی شعبہ گری کا نام نہیں اسلوب تو وہ ہے جس کو نفسِ مضمون سے جدا ہی نہیں کیا جاسکتا اور اسلوب صرف طرزِ تحریر سے نہیں مصنف کے انفرادی فکر اور زاویہ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلوب تو صفت کی ساری زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ اسلوب کو اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ اچھا قاری کبھی اسلوب کے بارے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ وہ کیا چیز ہے جس کو پڑھ کر ہم کہتے ہیں

کہ یہ میر کا طرز ہے، یہ محمد حسین آزاد کا رنگ ہے، دراصل یہی شخصیت یہی اسلوب ہے۔

اردو شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ اپنے اسلوب کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں تو اردو نثر میں غالب اور سرسید کے نام اہمیت رکھتے ہیں غالبؔ کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا بلکہ ان کی سیرت کے تمام پہلوان کے مکاتیب میں مل جاتے ہیں یہی ان کے صاحبِ اسلوب ہونے کی دلیل ہے۔ سرسیدؔ کے اسلوب کی خصوصیت اس کی سادگی ہے، وہ ایک متنوع اسلوب کے مالک ہیں لیکن ہر جگہ سادگی اپنا کمال دکھاتی ہے۔ سرسید کے بعد، حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ اور نذیرؔ احمد کے نام ملتے ہیں۔ حالی نے اردو نثر کو سنجیدگی، متانت اور تدبر سے آشنا کرایا، شبلی اپنی علمیت اور شعریت کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ نذیر احمد نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی۔ آزاد کے ہاں سرشاری اور بہار کی سی کیفیت ہے۔ ابوالکلام آزادؔ نے وزن وقار اور موضوع کی آب و تاب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ذاکر حسین کا اسلوب تاثراتی ہے۔

اس پس منظر میں آیئے رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا جائزہ لیں۔ رشید احمد صدیقی کے پاس دیگر انشاء پردازوں کا اثر بھی ملتا ہے، رشید صدیقی نے کسی نذیرؔ غازی پوری کا ذکر کیا ہے، لیکن مولانا ابوالکلام آزادؔ، سرسیدؔ، شبلیؔ، سجادؔ، انصاریؔ اور ڈاکٹر ذاکر حسینؔ کے اسلوب کی جھلکیاں ان کے ہاں ملتی ہیں، لیکن رشید صدیقی نے ان سب سے متاثر ہونے کے باوجود اپنا رنگ اور طرزِ خاص پیدا کیا جس کی تقلید کی اوروں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔

رشید صدیقی نے خواہ تنقید کی ہو، خواہ مرقع نگاری، تہذیبی مضامین لکھے ہوں یا کچھ، ہر جگہ ان کے اسلوب کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ خاص طور پر فقرے تراش کر اور صنعتِ تجنیس کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اسلوب کو تازہ و تابندہ رکھا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۳: اردو کے چند ممتاز صاحبانِ اسلوب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

سوال ۴: اس اکائی کا عمومی جائزہ لیجئے۔

جواب ۳ اور ۴ کے 10.2.2 اور 10.3 کے تحت دیکھئے۔

10.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو بتایا کہ اسلوب کیا ہے۔ دیگر زبانوں میں اسلوب کی کیفیت کیا رہی۔ آپ نے یہ بھی معلوم کیا کہ اسلوب دراصل شخصیت کا نام ہے۔ اس کا صرف الفاظ اور طرزِ تحریر سے تعلق نہیں بلکہ لکھنے والے کے نظریہ اور فکر سے بھی اس کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم نے اسلوب کے دیگر پہلو پر بھی نظر ڈالی۔ آپکی معلومات میں یہ بات بھی آئی کہ صاحبِ اسلوب فنکار کون کون تھے، اور ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت کیا تھی، اور یہ لوگ صرف اپنے موضوع اور مواد کی وجہ ہی سے نہیں اسلوب کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے اس بھی واقفیت حاصل کی کہ رشید صدیقی کے اسلوب پر کن احباب کے اسلوب کے اثرات رہے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ رشید صدیقی کے اسلوب کی خصوصیات کیا ہیں، اور وہ کن وجوہ سے اردو ادب میں اونچا مقام رکھتے ہیں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے۔ مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے اور ہم نے سفارشی کتب کی فہرست بھی دی ہے جس سے آپ کو مزید مطالعہ میں مدد ملے گی۔

10.5 نمونہ امتحانی سوالات:

سوال ۱: اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے، اس کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۲: اردو کے چند ممتاز صاحبِ اسلوب قلم کاروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

سوال ۳: رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا جائزہ لیجئے۔

10.6 فرہنگ:

لفظ	معنی	لفظ	معنی
تفہیم	سمجھانا	محاسن	حسن کی جمع، نیکی، اچھائی
ارتباط	ربط، تعلق	تنقیح	تحقیق

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
معائب	عیب کی جمع، خرابی	چاشنی	ذائقہ
فسوں	جادو	فیضان	فائدہ پہنچانا
تزکیہ	صفائی، پاک کرنا	طرب انگیزی	فرحت بخشنے والا
عزائم	عزم کی جمع، ارادہ	مدد غازی	بہادر، شیر
		اسلحہ،	ہتھیار

10.7 سفارشی کتب

۱۔اسلوب: عابد علی عابد

۲۔اردو کے اسالیب بیان: ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

وظیفہ یاب پروفیسر،

حیدرآباد

اکائی (۱۱) تنقیدی مطالعہ ۱

ساخت:

11.0 اغراض ومقاصد

11.1 تمہید

11.2 رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ

11.2.1 رشید احمد صدیقی کا زمانہ طالب علمی

11.2.2 تنقیدی مطالعہ

11.3 عمومی جائزہ

11.4 خلاصہ

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.6 فرہنگ

11.7 سفارشی کتب

11.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے جو تعلق خاطر ہے اس کے بارے میں جان سکیں

☆ رسید احمد صدیقی کے بچپن اور طالب علمی کے دور کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

☆ آپ "آشفتہ بیانی میری" کا تنقیدی جائزہ بھی لے سکیں گے۔

11.1 تمہید

اکائی میں رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے جو تعلق خاطر ہے اس کے بارے میں روشنی ڈالی گئی

ہے۔ رشید احمد صدیقی کے نزدیک علی گڑھ ایسا ادارہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی وہ ادبی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر علی گڑھ کی امتیازی حیثیت کے مدح ہیں اور اس کی انفرادیت تسلیم کرتے ہیں۔ اس اکائی میں علی گڑھ کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے۔ آپ رشید احمد صدیقی کے بچپن، گھر پر ان کی تعلیم اور علی گڑھ میں اُن کے دورِ طالب علمی سے بھی واقف ہوں گے۔ رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں اس تعلق سے جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جائیگا، کہ آپ آسانی سے رشید احمد صدیقی کے مزاج، اُن کے ذہن اور اُن کی شخصیت کو سمجھ سکیں۔

11.2 رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ اُن کی تحریروں میں یہ نقص پایا جاتا ہے کہ ان میں "علی گڑھ" بہت ہوتا ہے، اس لیے وہ لوگ جو علی گڑھ سے کم یا بالکل واقف نہیں ہوتے اُن کو ان مضامین یا اس طرح کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی اس حرکت سے بعض لوگ چڑنے لگے ہیں لیکن انہیں ایسے لوگوں سے شکایت ہے کہ وہ لوگ خود علی گڑھ سے کیوں واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہیں ہونا بجائے خود کسی فتور کی علامت ہے، اردو کا نام علی گڑھ بھی ہے۔!

رشید صدیقی کی جب کسی اجنبی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس کے طور طریقوں سے خوش ہوتے ہیں تو اس سے پوچھ لیتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کا کبھی طالب علم رہا ہے یا نہیں۔ جب انہیں معلوم ہوتا کہ اس شخص کا تعلق علی گڑھ سے رہا ہے، تعجب نہیں ہوتا، اور جب اس کا تعلق علی گڑھ سے نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت سے کیوں محروم رہا۔ اس سے یہ جتانا مقصود نہیں کہ علی گڑھ کا ہر لکھا پڑھا ہر خوبی سے مصنف ہوتا ہے اور جو علی گڑھ کا نہیں ہوتا وہ ان خوبیوں سے عاری ہوتا ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علیگڑھ کا ایک خاص رنگ، اور رکھاؤ یا ٹھپہ ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز اور متاثر کرتا ہے۔ اس ٹھپہ کے بھی کئی اقسام ہیں۔ بعض پسندیدہ، بعض ناپسندیدہ، علیگڑھ کوئی جنت یا جہنم نہیں ہے جہاں صرف منتخب لوگوں کے

قیام وطعام کا بندوبست رہتا ہے۔ وہ تو اسی دنیا جیسی دنیا ہے جہاں اپنی جنت یا جہنم بنانے کی ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ محض علیگڑھ کا ہونا کسی شخص کے معقول ہونے کی دلیل نہیں۔

رشید احمد صدیقی کا کچھ ایسا خیال ہے کہ ان کی پسند ناپسند رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر نظر جسے بحیثیت مجموعی "شخصیت" کہتے ہیں سب کی سب علیگڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لئے وہ اپنے گھر اور اسکول سے لائے تھے، لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ لمس و لذت اور صورت و معنی علیگڑھ نے دیئے۔ اگر وہ علی گڑھ نہ آتے اور ان کی صلاحیتوں کا سابقہ اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا جو علی گڑھ کہلاتا ہے، تو انہیں اندیشہ تھا وہ صلاحیتیں مضر ثابت ہوتیں۔ انہوں نے نہ کبھی محسوس کیا نہ کسی نے انہیں بتایا کہ ان پر علی گڑھ کا جو اثر ہوا وہ فی الجملہ اُن کے یا دوسروں کے لیے نامبارک ثابت ہوا۔ البتہ علی گڑھ نے جتنا فائدہ انہیں پہنچایا اس سے یقیناً بہت کم فائدہ رشید احمد صدیقی علی گڑھ کو پہنچا سکے۔ رشید صدیقی کو اعتراف ہے کہ ان میں کمزوریاں بھی ہیں گو وہ اس کے جواز میں کسی قیمت پر یہ کہنے کے لیئے تیار نہیں ہیں کہ کون ہے جس میں کمزوریاں نہیں ہوتیں، لیکن رشید صدیقی کہتے ہیں کہ یہ کمزوریاں علیگڑھ کی دی ہوئی نہیں وہ ان کمزوریوں کو اپنے ساتھ لائے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید علیگڑھ کی پیدا کی ہوئی ان میں کوئی کمزوری نہیں۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ جب ان کی کتاب "طنزیات و مضحکات" شائع ہوئی، جس کا انتساب انہوں نے علی گڑھ کے نام کیا ہے تو کسی نے پوچھا کہ انہوں نے لکھنے کا انداز کہاں اور کیوں پایا۔ رشید احمد صدیقی کی زبان سے بے اختیار نکل گیا، "علی گڑھ نے دیا۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ علیگڑھ یونی ورسٹی کی حیثیت محض ایک درسگاہ کی نہیں اس کی حیثیت ایک وسیع خاندان کی بھی ہے۔ ایسا خاندان جو ہر طبقہ اور ہر مزاج کے خورد و کلاں پر مشتمل ہو۔ طلبہ کی اقامت گاہوں کے آس پاس اساتذہ، اولڈ بوائز اور دوسرے چھوٹے بڑے ملازمین اور متوسلین کے خاندان بھی دور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے۔ یونی ورسٹی کے کسی سکونتی مکان میں بیرونی یا غیر متعلق شخص کو ذاتی حیثیت سے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ شریف نوجوان طلبہ کی موجودگی کا احساس ان خاندانوں کو اور ان خاندانوں کے رہن سہن اور عزت و ناموس کا لحاظ ان طلبہ کو غیر شعوری طور پر رہتا۔ اس طرح شریف گھرانے کی روایات کا پاس مدت الایام سے ہمہ وقت دونوں کو رہتا۔ اس لیے یہاں کوئی ایسی ویسی

بات جلد راہ نہیں پا سکی جو دیرینہ قیمتی روایات کو مجروح کر سکے چنانچہ جب سے یہ ادارہ قائم ہوا ہے کوئی ایسا حادثہ اس کے حدود کے اندر پیش نہیں آیا جو دیرینہ آئیں شرافت کا منافی ہو۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ علیگڑھ کی روایت کی دھوپ چھاؤں میں مختلف دیار مختلف طبائع اور طبقات کے جتنے طلبہ ایک دوسرے کے کمروں میں بورڈنگ ہاؤسوں میں، ڈائنگ ہال میں، کھیل کے میدانوں میں، مسجد میں، باغ میں، بازار میں، جماعتِ اساتذہ کے اراکین سے اولڈ بوائز سے متواتر اور مسلسل ملتے رہتے تھے، اتنے شاید ہی کہیں نظر آئیں۔ رشید احمد صدیقی کے بموجب اس طور پر ظاہر ہے یہاں کے طلبہ فرخی، فرزانگی، فراز بینی اور شریفانہ جاں نثارانہ شرافت کے اوصاف سے متصف ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۱: رشید احمد صدیقی کے علیگڑھ سے تعلق خاطر کے بارے میں تحریر کیجئے۔

سوال ۲: علیگڑھ کی جن خوبیوں پر رشید صدیقی نے روشنی ڈالی ہے اپنے الفاظ میں لکھئے۔

جوابات ۱، ۲: سوال ۱ اور ۲ کے جوابات 11.2 میں دیکھئے۔

11.2.1 رشید صدیقی کا زمانہ طالب علمی:

رشید احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق ہوئی، یعنی انہوں نے قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر مولوی صاحب سے حاصل کی۔ انہیں اردو اور حساب کی تعلیم کے لئے دیہات کے تحتانی اسکول جانا پڑا۔ اور پھر انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جونپور میں داخلہ لیا، یہیں سے اُن کی بورڈنگ ہاؤز کی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ ان دنوں رشید صدیقی کا دل پسند مشغلہ انسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ وہ برسات کے موسم میں بھی جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہیں جا سکتا تھا، ایک کتب خانے میں جو دوسری منزل پر تھا کھڑکی متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ انہوں نے اس دوران بہت کچھ پڑھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں انگریزی

کے مطالعہ سے فائدہ پہنچا۔ اُن کی انگریزی بہتر ہوگئی۔

رشید احمد صدیقی کا دل لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال میں لگتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ علیگڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے، جتنا علیگڑھ کے کھیل کے چرچے سن کر آئے۔ نیز علی گڑھ کی عام وقعت و وقار کا چرچا سن کر۔ اور جلد ہی وہ ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگے۔ رشید احمد صدیقی نے ۱۹۱۵ء میں علیگڑھ میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ سیاسی طور پر بڑی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ اسی سال محمد علی اور شوکت علی کی نظر بندی عمل میں آئی۔ ۱۹۱۸ء میں مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا، پھر خلافت تحریک شروع ہوئی اور ترکِ موالات وغیرہ۔ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ پر ترکِ موالات کا حملہ ہوا اور کئی مخلص اور ہونہار طلبہ نے اس ادارے کو خیر باد کردیا۔ اسی سال مولانا محمود الحسن اور حکیم محمد اجمل خاں کے ہاتھوں جامعہ ملیہ کی تاسیس کا اعلان علی گڑھ کی جامع مسجد میں ہوا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ انہیں پڑھنے کو کالج میں داخلہ مل گیا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ۔ اس زمانہ میں جون میں داخلہ ہوجاتا تھا۔ تعطیل کلان برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا تھا۔ نئے پرانے طلبہ کے ملنے پر جتنی تفریح ہونے والی ہوتی وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہوجاتی۔ زمانہ طالب علمی میں کالج کا جو میگزین "علی گڑھ منتھلی" شائع ہوا کرتا تھا، اس کے اردو ہی کے نہیں انگریزی حصہ کے مدیر بھی رشید احمد صدیقی ہی تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ انہیں ابتداء میں کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی، اور قدم قدم پر ایسے لوگوں کا سامنا ہوا۔ جو طرح طرح کی اردو اور طرح طرح کے لہجہ اور تلفظ میں بولتے تھے۔ انہیں اس پر بڑا تعجب ہوتا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ہر جگہ جون پور کی جیسی ثقہ اردو بولی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ رشید احمد صدیقی جب علامہ اقبال سے لاہور میں ملے تو ان کا لہجہ اور تلفظ سن کر انہیں بے حد تعجب ہوا۔ اور دھیرے دھیرے انہیں احساس ہوگیا کہ ہندوستان بھر میں اردو کے مختلف لہجے، تلفظ، اسالیب اور آداب ہیں۔ قطع نظر اس کے شعر گوئی اس قدر عام تھی کہ رشید احمد صدیقی سمجھتے تھے، ہر اُردو دان شاعر ہوتا ہے۔ غرض مجموعی طور پر شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اردو میں کیا، طلبہ میں فارسی کے ایسے سخن فہم موجود تھے کہ شعر سنتے ہی واہ واہ سے مجلس گونج اٹھتی، مباحثوں اور تقاریر کا بازار بھی گرم تھا اور ان میں طلبہ نہایت جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے، اردو

میں غالبؔ اور فارسی میں عرفی و نظیری کے معترف اور مدح زیادہ تھے۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا سکہ ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ کالج میں ذوقؔ کا کوئی حمایتی نہیں رہا۔

رشید احمد صدیقی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کالج اور یونی ورسٹیوں میں طلبہ کی یونین کو جو حیثیت آج کل حاصل ہے وہ نہیں تھی۔ پہلے یونین سے کردار نمو پائے تھے، اور زندگی اور شعر و ادب میں ان کا مقام ہوتا تھا۔ رشید احمد سدیقی کے بموجب پہلے زمانے میں طلبہ، سیاسی، اور مذہبی لیڈروں کے ہاتھوں میں اتنے نہیں تھے جتنے اب ہیں۔ ام اے او کالج میں نعروں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ سب کو اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا اور سارے طلبہ، صبر، اعتماد اور ذمہ داری سے کام کرتے تھے اور نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجہ کا انتظار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ اس دور میں تقریر کرنے کے فن کو بڑا ممتاز درجہ دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں جتنے اچھے مقررین تھے اُن میں سے بیشتر کئی تقریر سننے کا موقع رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ ہی میں ملا۔ اس پس منظر میں رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی حیثیت ایک درس گاہ کی نہیں رہی اس کی نوعیت ایک وسیع خاندان کی ہے۔ ایسا خاندان جو ہر طبقہ اور مزاج کے خورد و کلاں پر مشتمل ہو۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۳: رشید صدیقی کی تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

سوال ۴: اس زمانے کے علی گڑھ کی تصویر رشید احمد صدیقی نے کیسے کھینچی ہے۔ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

جوابات ۳، ۴؛ سوالات ۳ اور ۴ کے جوابات 11.2.1 میں دیکھئے۔

11.2.2 تنقیدی مطالعہ

رشید احمد صدیقی اردو کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، طنز و مزاح نگار، ناقد اور تہذیبی قدروں کے پارکھ ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا اور بہت لکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے حالاتِ زندگی آپ کو

مختلف کتابوں میں مل جائیں گے، لیکن "آشفتہ بیانی میری" میں رشید احمد صدیقی نے اپنے بارے میں جو لکھا ہے وہ کئی زاویوں سے توجہ طلب ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا مرکز و محور علی گڑھ ہے۔ رشید صدیقی کو اس کا اعتراف ہے کہ بعض لوگ اس کو پسند نہیں کرتے لیکن وہ اپنے موقف پر اصرار کرتے ہیں۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ ایسے لوگ خود علی گڑھ کیوں واقف نہیں کیونکہ رشید احمد صدیقی کے نزدیک اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود ایک فتور کی علامت ہے۔

یہ بات اپنی جگہ درست کہ فن کار کو اپنا حلقہ محدود نہیں کر لینا چاہیئے اس کو چاہیئے اپنے وطن یا ایسے ہی کسی مقام سے خواہ کتنی ہی وابستگی ہو لیکن اس کا وزن بے حد وسیع ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ یوں کسی ایک جگہ یا علاقہ سے وابستگی اس کے وزن کو محدود کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ کو اپنی تحریروں میں رچا بسا لینے کی وجہ سے وہ لوگ جو علی گڑھ کے بارے میں اتنا نہیں جانتے رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے، لیکن رشید احمد صدیقی ایسے اعترافات اور تنقیدوں سے قطعی بے نیاز ہیں۔ وہ اپنی پسند و ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار، اور بحیثیت مجموعی شخصیت کو علی گڑھ کی دین قرار دیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی علی گڑھ کے بارے میں اتنی شدید وابستگی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی خوبیوں کو تو علی گڑھ کی سمجھتے ہیں لیکن اپنی خامیوں کا ذمہ دار وہ علی گڑھ کو قرار نہیں دیتے، حالانکہ علی گڑھ آنے سے پہلے بھی رشید احمد صدیقی مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن وہ اپنے لکھنے کے انداز کو علی گڑھ کی دین قرار دیتے ہیں۔ وہ علی گڑھ کو صرف ایک درسگاہ نہیں بلکہ ایک وسیع خاندان قرار دیتے ہیں، اور صرف علی گڑھ کی تہذیب کو بالاتر قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے ملک میں تہذیبی شہر اور ادارے کئی ہیں، رشید احمد صدیقی اگر ایسا کہتے ہیں تو ان سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ غرض رشید احمد صدیقی کے نزدیک علی گڑھ سب کچھ ہے، لیکن یہ کہنے میں بھی تکلف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ نہیں ہمارے ملک میں اور بھی بہت کچھ ہے۔

رشید احمد صدیقی نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی جیسا کہ اس دور کا عام دستور تھا۔ مولوی صاحب گھر پر پڑھانے آتے تھے۔ بعد میں انہوں نے جون پور کا رخ کیا اور جب بھی موقع ملا۔ انہوں نے اپنے مطالعہ کی طرف توجہ دی، چنانچہ اُن کا اردو کا ہی نہیں انگریزی کا مطالعہ بھی بغایت وسیع تھا۔ رشید احمد صدیقی کے علی گڑھ آنے کی وجوہات یہ تھیں کہ وہ یہاں کے کھیلوں کی شہرت سن چکے تھے، چنانچہ یہاں

انہوں نے فٹ بال، کرکٹ اور ہاکی میں بھی حصہ لیا لیکن ٹینس کے وہ عمدہ کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔
رشید احمد صدیقی کے تعلق سے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ جب ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کی تحریک کے ضمن میں علی گڑھ کے کئی طلبہ نے جن میں اُن کے قریبی دوست ڈاکٹر ذاکر حسین بھی شامل تھے، علی گڑھ چھوڑ دیا۔ رشید احمد صدیقی نے قومی تحریک میں حصہ نہیں لیا اس کو رشید احمد صدیقی کی بے عملی کہئے، سیاست سے دور رہنا کہئے یا علی گڑھ کی محبت لیکن یہ ضرور کہا جائیگا کہ رشید احمد صدیقی کو ترکِ موالات میں حصہ لینا ضرور چاہیئے تھا۔ رشید احمد صدیقی نے تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ تحریر و تصنیف کو اپنی زندگی بنا لیا۔ "علی گڑھ منتھلی" اردو اور انگریزی کے مدیر رہے، رشید احمد صدیقی کے نزدیک جونپور کی اردو کا لہجہ تھا، جس کو وہ ثقہ قرار دیتے ہیں اور دوسرے علاقوں کے لہجوں کے بارے میں اُن کے تاثرات ٹھیک نہیں۔ حتیٰ کہ علامہ اقبال کے لہجہ کے بارے میں بھی وہ یونہی خیال ظاہر کرتے ہیں، لیکن اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ کوئی زبان جتنے زیادہ وسیلے علاقہ میں بولی جاتی ہے، مختلف علاقوں میں وہاں کی مقامی اور ازوس پڑوس کی زبانوں اور آب و ہوا کی وجہ سے اس کا لب و لہجہ جدا ہونا فطری ہے اور کسی علاقہ والے کو احساس برتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا لہجہ ہی درست ہے۔ سمجھ بوجھ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر علاقہ کے لوگ اپنے طور پر جو لہجہ رکھتے ہیں اس کو غلط نہ کہا جائے۔ ہم کو سب لہجوں کا احترام کرنا چاہیئے۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے اور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

"آشفتہ بیانی میری" کا سب سے اہم رخ اس کا انداز بیان ہے، شگفتہ، پرکشش، اور دلکش انداز بیان، یہ رشید احمد صدیقی ہی کا قلم ہے جو ایسی اردو لکھ سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریریں اپنے مواد کی وجہ سے نہیں اپنے اندازِ بیان کے باعث بھی اہمیت رکھتی ہیں، بلکہ اندازِ بیان کی وجہ سے زیادہ!

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

سوال ۵: علی گڑھ کے بارے میں رشید احمد صدیقی کے خیالات سے بحث کیجئے

سوال ۶: اردو کے مختلف لہجوں کے بارے میں رشید صدیقی کے خیالات پر نوٹ لکھئے

جوابات ۵، ۶: سوال ۵ اور ۶ کے جوابات 11.2.2 میں دیکھئے۔

11.3 عومی جائزہ:

رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے غیر معمولی جذباتی وابستگی اور ان کے نزدیک اردو جاننا اور علی گڑھ سے واقف نہ ہونا، بجائے خود ایک فتور کی علامت ہے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ علی گڑھ کا ہر پڑھا لکھا ہر خوبی سے متصف ہوتا ہے لیکن ان کے نزدیک علی گڑھ کا جو رنگ اور خاص ٹھپّہ ہے وہ اسے دوسروں سے ممیّز کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ ان کی پسند و ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار، اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی شخصیت کہتے ہیں وہ علی گڑھ میں ڈھلیں ان میں جو خوبیاں ہیں وہ علی گڑھ کی وجہ سے اور جو خوبیاں ہیں، وہ ان کی اپنی ہیں اور علی گڑھ کی پیدا کردہ ان میں کوئی کمزوری نہیں۔ انہوں نے لکھنے پڑھنے کا انداز علی گڑھ سے سیکھا ہے۔ وہ علی گڑھ کو ایک درس گاہ نہیں ایک وسیع خاندان قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہاں کے طلبہ فرخی، فرزانگی، فراز بینی، اور شریفانہ جاں نثاری کے اوصاف سے متصف ہیں۔

رشید صدیقی کی بالکل ابتدائی تعلیم قدیم انداز سے ہوئی یعنی گھر پر مولوی صاحبآ کر پڑھایا کرتے تھے، بعد میں دیہات کے تحتانی اسکول اور پھر جونپور میں انہوں نے تعلیم پائی۔ اس دوران انہوں نے اپنے مطالعہ کو جاری رکھا اور اردو اور انگریزی کے کئی ناول اور افسانوں کے کئی مجموعے پڑھ ڈالے۔ سچ تو یہ ہے کہ علی گڑھ کے کھیلوں کی شہرت سن کر رشید صدیقی یہاں آئے تھے، چنانچہ انہوں نے فٹبال، ہاکی اور کرکٹ بھی کھیلا، لیکن ٹینس کے وہ عمدہ کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں علیگڑھ میں فرسٹ ایر میں داخلہ لیا یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اور سارے ملک میں سیاسی طور پر اتھل پتھل تھی۔ محمد علی شوکت علی کی گرفتاری، مسجد کانپور کا حادثہ، خلافت تحریک اور ترکِ موالات!۔

رشید احمد صدیقی علی گڑھ کالج کے میگزین "علی گڑھ منتھلی" کے اردو اور انگریزی کے حصوں کے مدیر بھی رہے۔ ابتداء میں انہیں کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ اردو کے مختلف مقامات سے آئے طلبہ کے لہجے بھی انہیں عجیب لگے۔ انہوں نے علی گڑھ کے اس دور کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں، مثلاً غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا سکہ رواں تھا، اور ذوق کا کوئی حمایتی نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں طلبہ کی یونین تھی لیکن اس کا مقصد طلبہ کی کردار سازی تھا۔ نعرہ بازی کو کوئی پسند نہ کرتا تھا، اور تقریر کرنے والوں کو معاشرہ میں ممتاز

درجہ دیا جاتا تھا۔ طلبہ مذہبی اور سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں اتنے نہیں تھے جتنے اب ہیں۔

علی گڑھ سے رشید احمد صدیقی کو جو وابستگی ہے لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں کہ کسی فنکار کو یوں کسی علاقہ کا ہو کر نہیں رہ جانا چاہیئے۔ کیونکہ فنکار کا وژن وسیع ہونا چاہیئے ءاور محدود وژن اس کے فن کو بھی محدود بنا دیتا ہے، رشید احمد صدیقی علیگڑھ کی تہذیب کو بالاتر قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمارے ملک میں تہذیبی شہر اور اور بے کئی ہیں، ان کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ غرض رشید احمد صدیقی کے نزدیک علی گڑھ کی اہمیت خواہ کچھ ہو یہ کہنے میں تکلف نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں صرف علی گڑھ نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ علی گڑھ سے اپنی وابستگی کہیئے ان کو بے عملی کہیئے یا سیاست سے عدم دلچسپی کہ رشید احمد صدیقی نے ترک موالات کی تحریک میں حصہ نہیں لیا، جب کہ ان کے کئی قریبی احباب جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی شامل تھے، علی گڑھ چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ کے قیام میں دلچسپی لی۔ رشید احمد صدیقی نے تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ تحریر و تصنیف میں دلچسپی لی اور اس میں اپنے کئی کارنامے چھوڑے "آشفتہ بیانی میری" کا سب سے اہم پہلو اس کا انداز بیان اور خوشگوار اور دلنشین اسلوب ہے۔ شگفتہ، دلچسپ اور پر کشش انداز بیان۔ یہ رشید احمد صدیقی ہی کا قلم ہے جو ایسی پیارے اور دلآویز اردو لکھ سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریریں صرف اپنے مواد کی وجہ سے نہیں اپنے اندازِ بیاں کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں، بلکہ انداز بیان کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی!

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۵: رشید احمد صدیقی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیئے۔

سوال ۶: اس اکائی کا مجموعی جائزہ پیش کیجئے۔

جوابات ۵، ۶: سوال ۵ اور ۶ کے جوابات 11.3 میں دیکھئے۔

11.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کو رشید احمد صدیقی کے بارے میں تنقیدی جائزہ سے واقف کرایا۔

"اغراض و مقاصد:" اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں، رشید احمد صدیقی کی علیگڑھ سے وابستگی کا ہم نے تمہیدی جائزہ لیا اور آپ کو بتایا کہ علی گڑھ ہی نہیں ہمارے ملک میں اور بھی کئی شہر ہیں کئی ادارے ہیں۔ ہم نے رشید احمد صدیقی کے دورِ طالبِ علمی کا بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ اگرچہ آپ نے اس سے پہلے بھی رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں لیکن اس تنقیدی جائزہ سے آپ کو رشید احمد صدیقی کے موقف کو تولنے اور صحیح اندازہ لگانے میں مدد ملی۔ آپ نے اپنے معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی درج ملیں گے۔ ہم نے سفارشی کتب کے نام بھی دیئے ہیں کہ آپ مزید مطالعہ کر سکیں۔

11.5 نمونہ امتحانی سوالات:

سوال ۱: علی گڑھ کے تعلق سے رشید احمد صدیقی کے تاثرات قلمبند کیجئے۔

سوال ۲: علی گڑھ کی وہ کیا خصوصیات ہیں جنہوں نے رشید احمد صدیقی کو اپنی طرف کھینچا۔

سوال ۳: رشید احمد صدیقی کے زمانہ طالب علمی کے حالات پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۴: رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کے بارے میں تنقیدی مضمون لکھئے۔

11.6 فرہنگ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
نقص	خرابی	مفر	نقصان دہ
فتور	خرابی	اقامت	رہنے کا انتظام
نعت	مال و دولت: لذیذ چیز	اولڈ بوائز	پرانے طالب علم
ٹھپّہ	چھاپ	مجروح	زخمی، متاثر

بندوبست	انتظام	دیرینہ	قدیم
لمس	کسی چیز کو ہاتھ لگانا، چھونا۔	آئین	طور طریقے
وقعت	عزت، اعتبار	طبائع	طبیعت کی جمع، مزاج
متصل	لگا ہوا	فرض	کشادگی وسعت
نظر بندی	حراست، قید	فراربنی	وسیلہ نظری سے دیکھنا
معترف	اعتراف کرنے والا	فرزانگی	عقل مندی
مداح	تعریف کرنے والا	ریاضت	محنت، شفقت

11.7 سفارشی کتب:

۱۔ رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن — پروفیسر اطہر جاوید

۲۔ رشید احمد صدیقی " فکر و نظر " علی گڑھ — پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
وظیفہ یاب پروفیسر
حیدرآباد

اکائی (۱۲) تنقیدی مطالعہ ۲ (مسلسل)

ساخت:

12.0 اغراض ومقاصد

12.1 تمہید

12.2 علی گڑھ، کرکٹ

12.2.1 علیگڑھ کے مشاعرے

12.2.2 علیگڑھ کی نامور شخصیات

12.2.3 تنقیدی مطالعہ ۲

12.3 عمومی جائزہ

12.4 خلاصہ

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.6 فرہنگ

12.7 سفارشی کتب

12.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ رشید احمد صدیقی کی علی گڑھ کے کھیلوں بالخصوص کرکٹ سے دلچسپی سے واقف ہو سکیں

☆ علی گڑھ نے بحیثیت ادارہ کے جو سماجی اور تہذیبی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا جائزہ لیں۔

☆ علی گڑھ کی ممتاز شخصیات کے حالات سے واقف ہوں۔

☆ علی گڑھ کی ان ممتاز شخصیتوں کے کارناموں پر روشنی ڈال سکیں۔

12.1 تمہید:

اس اکائی میں علی گڑھ کے کھیلوں پر عمومی روشنی ڈالی گئی، اور خاص طور پر کرکٹ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، جس سے رشید احمد صدیقی کو گہری دلچسپی تھی۔ علی گڑھ نے کئی نامور شخصیات پیدا کی ہیں، جنھوں نے نہ صرف علی گڑھ کی بلکہ، برصغیر کی معاشرتی، ادبی اور علمی زندگی میں گراں قدر حصہ ادا کیا:۔ آپ اس اکائی میں ایسی ممتاز شخصیات کی زندگی کی حالت اختصار کے ساتھ پڑھیں گے، اور ان کے کارناموں کا جائزہ لے سکیں گے۔ آخر میں علی گڑھ کے کھیلوں وغیرہ اور ان شخصیات کی حیات اور خدمات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اور علی گڑھ میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں اور بالخصوص مشاعروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔

12.2 علی گڑھ کرکٹ

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں وہ علی گڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے جتنا علی گڑھ کے کھیل اور اُن کی عام وقعت اور وقار کا چرچا سن کر۔ ان کا دل لکھنے پڑھنے سے زیادہ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال میں لگتا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ کرکٹ کا کھلاڑی زیادہ قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ انگریز چاہے کیسے رہے ہوں لیکن اُن کے ہاں کھیل کا احترام ہے، بالخصوص کرکٹ کا۔ رشید احمد صدیقی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے بڑے میچ ہوئے جن میں ہندوستان کی تقریباً تمام مشہور ٹیموں نے شرکت کی ہے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کے فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی اور علی گڑھ کی فتوحات نے ایک حد تک روایت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رشید احمد صدیقی چاہتے تھے کہ علیگڑھ میں کرکٹ کی داستاں مرتب کی جائے اور یہاں کرکٹ کا میوزیم ہو جس میں کرکٹ سے متعلق معلومات اور اشیاء رکھی جائیں۔ رشید احمد صدیقی کے بموجب ۱۹۱۵ء میں ہز ہائی نس بھوپال پرنس حمید اللہ خان کی کپتانی کا دور ختم ہو چکا تھا، اور کالج کے کرکٹ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ کرکٹ کا اجتماع ستھرا صاف اور شاندار ہوتا تھا۔ کھلاڑی کرکٹ کا اعلیٰ درجے کا یونی فارم زیب تن کیے فیلڈ میں اطمینان اور وقار کے ساتھ اترتے تھے۔

علی گڑھ کے کرکٹ کے کھلاڑی مشاق اور منجھے ہوئے تھے، کبھی نہ چوکنے والے فیلڈرس، اور جو مجمع کھیل دیکھنے آتا تھا، اچھے اسٹروک، اچھی بولنگ اور اچھی فیلڈنگ کی فی الفور داد دیتا تھا۔ اپنے کھلاڑیوں کے ہوں یا غیر۔ اب تو ریفری کے فیصلے سے اختلاف کیا جاتا ہے، بلکہ اس غریب کو زور وکوب کی نوبت بھی آجاتی ہے، لیکن ان دنوں ریفری کا فیصلہ کا غیر معمولی احترام کیا جاتا تھا۔ کسی کو اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اور کھیل کھلاڑی تماشائی سبھی ریفری کی حفاظت میں ہوتے تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔ ام اے او کالج اور اس کے کچھ دنوں بعد تک کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، اور ٹینس کو دوسرے کھیلوں کے مقابلہ میں ممتاز سمجھا گیا اور ایک طور پر اسپورٹس مین شپ کا تصور انہی کھیلوں سے وابستہ رہا۔

12.2.1 علی گڑھ کے مشاعرے:

رشید احمد صدیقی کا ابتدائی زمانہ جون پور میں گزرا اور پھر وہ علی گڑھ آئے۔ جون پور علم وادب کا گہوارہ رہا ہے، وہاں "شاعروں" شاعری اور مشاعرے کے چرچے تھے، حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا ہر اردو دان شاعر ہے۔ رشید احمد صدیقی علی گڑھ آئے تو انہوں نے یہاں دیکھا کہ یہاں بھی مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے، محض شعر وسخن کے اعتبار سے نہیں، ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے۔ مشاعروں کی کثرت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کو ہمارے معاشرہ میں کس درجہ مقبولیت حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بموجب مشاعروں کی روایت عرب سے ایران ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور اس کو جتنی شہرت اور ترقی یہاں نصیب ہوئی شاید خود عرب اور ایران میں نہ ملی ہو۔ شعر وسخن کی ترقی اور اشاعت کا ایک موثر ذریعہ مشاعرہ سمجھا جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں اگر کسی شاعر کو حسنِ قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلم ہو جاتی ہے، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کا کلام علی گڑھ میں بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ حسرتؔ بھی علی گڑھ کے بہت مقبول شاعر تھے۔ ثاقب صفی اور محشر، لکھنو سے تشریف لائے، ثاقبؔ کے پڑھنے کا انداز دلکش تھا۔ اظہر جے پوری بھی علیگڑھ آئے اور جلد ہی اُن کی استادانہ حیثیت مسلم ہوگئی۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ پہلے مشاعرہ شعر

وادب کی خدمت کو ملحوظ رکھ کر مستند ادارے دربار یا شعروادب کے اکابر منعقد کیا کرتے تھے۔ اب مشاعرے دولت مند تاجر یا ٹھیکیداروں کی طرف سے منعقد ہوتے یں، اور ان کا مقصد شعروادب کی خدمت نہیں اپنے کاروبار کا اشتہار ہوتا ہے۔ کالج کے مشاعروں میں ہونگ ہوتی تھی۔ فقرے بھی کسے جاتے تھے، لیکن ایسے ہوتے تھے کہ اچھے شعر کا مزہ دے جاتے تھے۔ اس زمانے میں شعراء دبستانوں میں تقسیم تھے، لیکن علی گڑھ میں یہ سب آتے کیونکہ علی گڑھ نے اپنے آپ کو کسی دبستان سے وابستہ نہیں کیا۔ مشاعرے کے بعد شعراء جب تک علی گڑھ میں ہوتے طلبہ اُن سے ملاقات کرتے اور سعروادب کے رموز پر تبادلہ خیال ہوتا۔ اور ایک کھلی ادبی اور شعری فضاء سامنے آتی۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۱: علی گڑھ میں کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کے بارے میں روشنی ڈالئے

سوال ۲: علی گڑھ کی ادبی سرگرمیوں اور مشاعروں کا جائزہ لیجئے۔

جوابات ۱و۲: سوال ۱ اور سوال ۲ کے جوابات: 12.2 میں دیکھئے۔

12.2 علی گڑھ کی نامور شخصیات:

ڈاکٹر ذاکر حسین:

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ وہ فسٹ ایئر میں داخل ہوئے تو مولانا اقبال احمد خان سہیل کے توسل سے ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی اور جیسے جیسے زندگی نشیب اور فراز سے گذرتی اُن سے اخلاص یگانگت اور بے تکلفی کے تعلقات اور بڑھے اور گہرے ہوتے گئے۔ ذاکر صاحب اور ان کے بھائی مظفر حسین خان اور عابد حسین خان، تینوں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے۔ طرابلس کی جنگ کے دوران ترکوں کے لیے ذاکر صاحب اپنے اسکول میں جس جوش اور انہماک سے چندہ جمع کرتے اور جیسی ولولہ انگیز تقریر کرتے تھے، وہ اب تک اُن کے ساتھیوں کو یاد ہے۔ بی۔اے۔ کے امتحان میں ذاکر صاحب کی پوزیشن آئی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد علی گڑھ کی باز آبادکاری میں ذاکر صاحب کا قابلِ قدر حصہ رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے وہ یہاں کے حالات سے آشنا تھے، اور ان کے دل میں علی گڑھ نے گھر کرلیا تھا۔ یہاں سے جدا ہوکر انہوں نے جامعہ ملیہ کا کام سنبھالا اور ہر طرح کی مصیبت جھیل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کردیں۔ علی گڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے جو خدامات انجام دیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ انہوں نے ایک درس گاہ کو نہیں بلکہ ایک تہذیب کو تباہ ہونے اور ایک روایت کو رسوا ہونے سے بچالیا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ جس طرح سرسیّد نے اپنے عہد میں مسلمانوں کی باز آبادکاری بحیثیت مجموعی مدرسۃ العلوم کے وسیلہ سے کی، حالات کو دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادکاری علی گڑھ کے وسیلے سے کرنی پڑے گی۔ ذاکر صاحب سے نیک توقعات وابستہ کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ میں ذاکر حسین صاحب کو نہ ولی سمجھتا ہوں نہ فرشتہ نہ امام شریعت نہ پیرِ طریقت۔ لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی وہ فرزندان علی گڑھ میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔

پروفیسر انعام اللہ خان:

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ ایم۔اے۔کالج کے اسٹاف میں جن دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے میں بڑی شہرت حاصل تھی ان میں ایک پروفیسر انعام اللہ خان تھے۔ انعام اللہ خان بہار کے رہنے والے تھے۔ بڑے شریف النفس، سادہ مزاج لیکن اتنے ہی جذباتی۔ پان کثرت سے کھاتے تھے اور بڑے اصرار سے کھلاتے تھے، لباس نہایت معمولی درجے کے کپڑے کا ہوتا، ضرورت سے زیادہ لمبی شیروانی سے بے اختیار قہقہ لگا کر ہنستے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ انعام اللہ خان اپنے دور کے ممتاز اور مقبول معلموں میں تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کے کچھ دنوں اتالیق رہے۔ اپنی ٹم ٹم پر ان کو کالج لاتے تھے۔ انعام اللہ خان انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ مرصع اور مقفع انگریزی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ منطق سے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔

مولانا سہیل:

رشید احمد صدیقی نے مولانا اقبال حمد خان سہیل کا ذکر نہایت عقیدت واحترام سے کیا ہے وہ نہایت شریف النفس، شفیق، ذہین، اور ذی علم تھے۔ دوستوں کے لیے ان کے دل میں وسعت نرمی اور نوازش تھی، رشید احمد صدیقی سے ان کے تعلقات (۴۰) سال تک رہے، اور وہ ہمیشہ دل جوئی اور دل آسائی کی کوشش کرتے، مولانا سہیل ہی کے توسل سے رشید صدیقی نے ذاکر حسین سے ملاقات کی تھی۔ کم لوگوں کو فارسی کے کلاسیکی ادب پر اتنا عبور ہوگا جتنا مولانا سہیل کو تھا۔ جن لوگوں نے فارسی میں ام ۔اے، لے رکھا تھا، اور مولانا کے دوست یا عقیدت مند تھے مولانا ان کو خاقانی اور عرفی کے قصائد پڑھا یا کرتے تھے۔ غالب، عرفی، اور نظیری کی شاعری کے نکات اور نزاکتیں واضح کرنے میں مولانا کو کمال تھا جہان تہاں علامہ شبلی کے مماثل اشعار سنا جاتے۔ رشید صدیقی کہتے ہیں کہ ذہن کی درا کی میں سہیل صاحب کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے، سوائے ذاکر صاحب کے۔ شاعری میں علامہ شبلی کا اور تفہیم قرآن میں مولانا حمید الدین فراہی کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ ظہوری کی نثر اور ذوق کی شاعری پسند نہ تھی۔ کچھ لوگ مولانا سے غزل لکھوا کر مشاعرہ میں پڑھتے تھے۔ مولانا ایسے مشاعروں میں اکثر شریک نہ ہوتے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ شعر وادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روزمرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کردی تھی۔ انگریزوں، انگریزی حکومت، اور انگریزی طور طریقوں سے مولانا ہمیشہ بیزار رہے۔ یہ ان کی فطرت ہوچکی تھی، چنانچہ انہوں نے غزلوں میں بھی سیاسی طنز کے نوک ونشتر سے انگریزوں کو نشانہ بنایا۔ وہ وطن، خاندان، ماحول، معتقدات، تعلیم وتربیت، رہن سہن کے اعتبار سے قطعی مشرقی تھی، قطعی مذہبی، آغا حیدر حسن جیسی شخصیت سے بھی رشید احمد صدیقی نے مولانا ہی کی وجہ سے ملاقات کی۔

ایک اور پروفیسر تھے ا۔ انیف رحمٰن، تاریخ کے پروفیسر، ممبر لجسلیٹیو کونسل، اور ممبر پبلک سروس کمیشن، چلپائی گوڑی (بنگال) کے رہنے والے تھے۔ بڑے اونچے اور معمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ گورنمنٹ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ نہایت شرمیلے اور شریف۔ کلاس میں لکچر دیتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے، انگریزی شیریں اور شائستہ لہجہ میں بولتے تھے۔ لڑکوں کے اصرار پر یونین کے

مباحث میں حصہ لیتے، اور مباحثہ میں ان کا مقابلہ اکثر پروفیسر انعام اللہ خان سے ہوتا۔ پروفیسر رحمٰن اپنی تقریر میں کسی پر نکتہ چینی نہ کرتے لیکن امور تنقیح طلب کی وضاحت اس طرح کرتے کہ فریق مخالف کے تمام اعتراضات کا جواب آجاتا۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۳: ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

سوال ۴: مولانا سہیل کی علمیت اور لیاقت پر روشنی ڈالئے

جوابات ۳ اور ۴: سوال ۱۳ اور ۱۴ کا جواب 12.2 میں دیکھیے۔

12.2.3 تنقیدی مطالعہ:

رشید احمد صدیقی علی گڑھ کے عاشق ہیں۔ ان کی نظر علی گڑھ کی خوبیوں پر رہی، علی گڑھ کی خامیوں کو انہوں نے یا تو نظر انداز کر دیا یا انہیں خوبیوں کے طور پر پیش کیا۔ رشید احمد صدیقی بتاتے ہیں کہ کھیل کود سے انہیں ابتداء سے دلچسپی رہی اور وہ علی گڑھ دراصل یہاں کے کھیلوں کی شہرت سن کر آئے تھے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، اور ٹینس، جیسے کھیل علی گڑھ میں معروف تھے، اور چونکہ انگریز کھیلوں کو زندگی میں بڑی اہمیت دیتے ہیں، اس لیے انگریز پرنسپل ان کھیلوں کی ہمت افزائی کرتے اس لیے یہی کھیل علی گڑھ میں خاص طور پر معروف رہے۔ رشید احمد صدیقی نے کرکٹ اور ٹینس سے زیادہ دلچسپی لی۔ ابتداء میں ٹینس سے اور پھر کرکٹ سے۔ رشید احمد صدیقی کے طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ، میچوں کا شہرہ تھا۔ ملک بھر کی اہم ٹیمیں یہاں آتیں اور میچ کھیلے جاتے۔ اچھے کھیل کی تعریف کی جاتی اور اچھے کھلاڑیوں کی قدر۔ ریفری کا احترام کیا جاتا اور کرکٹ کی تہذیب کو برقرار رکھا جاتا۔ غرض علی گڑھ میں کھیلوں اور خصوصاً

کرکٹ کے لئے سازگار ماحول تھا۔ رشید احمد صدیقی چاہتے تھے کہ علی گڑھ میں کرکٹ کے موضوع پر کتاب تحریر کی جائے اور میوزیم قائم کیا جائے۔ شعروادب کا ماحول بھی خاصا سازگار تھا۔ خاص طور پر شاعروں کی دھوم تھی۔ مشاعرے یہاں تہذیبی زندگی کا حصہ تھے اور کثرت سے منعقد ہوتے تھے۔ شاعروں کی ہوٹنگ بھی کی جاتی تھی اور اگر کسی شاعر کو علی گڑھ میں حسنِ قبول حاصل ہو جاتا تو ملک بھر میں اچھے اور مستند شاعر کی حیثیت سے اس کا مرتب مسلم ہو جاتا۔ فانی، اصغر، اور جگر علی گڑھ میں بے حد مقبول تھے۔ حسرت اگرچہ علی گڑھ ہی میں رہتے تھے لیکن ان کو بھی شہرت حاصل تھی۔ رشید احمد صدیقی نے ان مشاعروں کی اہمیت وافادیت اور شاعروں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شعروسخن کی ترویج واشاعت میں مشاعرے موثر اور مقبول ذریعہ ہیں۔ علی گڑھ کے مشاعروں میں لکھنؤ سے بھی شعراء شریک ہوتے جن میں ثاقب، صفی اور حشر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ادھر اطہر جے پوری بھی آجاتے اور ادبی فضا گرما گرم ہو جاتی۔ رشید احمد صدیقی اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اگرچہ شاعری میں دبستانوں کی اہمیت ہے اور ان سارے دبستانوں کو ایک جگہ جمع کر لینا آسان کام نہیں لیکن علی گڑھ چونکہ دبستانوں کی ایسی کوئی روایت قائم نہیں کی اس لیے یہاں اس خصوص میں بھید بھاؤ نہیں تھا۔ مختلف دستانوں کے شعرا یہاں بیک وقت خوشی خوشی آجاتے۔ اب مشاعروں کے آداب اور انداز بدل گئے ہیں، لیکن علی گڑھ کے مشاعرے کئی پہلوؤں سے یاد رکھے جائیں گے۔

علی گڑھ کی تہذیبی، علمی اور ادبی زندگی کو جن اصحاب نے رنگ وروپ دیا ہے اُن میں ایسی کئی شخصیات ہیں جو ہندوؤں کی قومی زندگی میں اپنی آن بان رکھتی ہیں۔ ایسی شخصیات میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر ذاکر حسین کا آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ذاکر صاحب سے تعلقات زمانہ طالب علمی سے تھے، اور حالات نے کیسا ہی نشیب وفراز اختیار کیا ہو، یہ تعلقات زندگی بھر قائم رہے۔ دونوں میں گہری یگانگت اور بے تکلفی تھی۔ رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں ذاکر صاحب کی تعلیمی، علمی، ادبی قابلیت، ان کے ذہن کی درا کی اور فہم وفراست اور معاملہ فہمی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ذاکر صاحب نے ترکِ موالات کے موقع پر علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے رشتہ جوڑ لیا، لیکن ان میں علی گڑھ کی فکر ہمیشہ رہی، چنانچہ اسی لیے وہ وائس چانسلر بن کر علی گڑھ آئے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ

ذاکر صاحبؒ نے سرسیدؒ کی طرح تقسیم ہند کے موقع پر مسلمانوں کی آبادکاری کی کوشش کی، اور مجموعی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کو دلاسہ دیا۔ علی گڑھ کی تاریخ میں ذاکر صاحب کا نام ہمیشہ جگمگا تا رہے گا۔ علی گڑھ کی دوسری قابلِ ذکر شخصیت جس کا آشفتہ بیانی میری میں ذکر ملتا ہے، وہ مولانا اقبال احمد سہیل ہے۔ اقبال سہیل، شریف النفس، شفیق، ذہین اور ذی علم انسان تھے۔ فارسی کے کلاسیکی ادب پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ رشید احمد صدیقی کے مطابق اقبال سہیل اور تو اور اپنے ملنے والوں، دوستوں اور عقیدت مندوں کو جو ام۔اے فارسی میں داخلہ لیتے خاقانی اور عرفیؔ کے قصائد پڑھاتے۔ انہیں غالبؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کی شاعری سے لگاؤ تھا۔ رشید احمد صدیقی نے جیسا کہ لکھا ہے مولانا سہیلؔ کو ذوق کی شاعری اور ظہوری کی نثر ناپسند تھی۔ ظاہر ہے یہ بیکار سی بات تھی ایک طرح کا ادبی تعصب! ورنہ ذوقؔ بھی اپنے رنگ کے ممتاز شاعر ہیں اور اردو شاعری میں ان کی اہمیت کم نہیں۔ بہرکیف مولانا کی علمی ادبی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا سہیلؔ انگریزوں کے مخالف تھے اور قطعی مشرقی اور مذہبی واقع ہوئے تھے۔ مولانا جیسی شخصیات کم ہی پیدا ہوتی ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ مولانا نے انگریزوں سے مخالفت کے باوجود ترکِ موالات میں حصہ نہیں لیا۔

رشید احمد صدیقی نے پروفیسر انعام اللہ خان کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے، اور انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے، وہ اپنے عہد کے ممتاز اور مقبول معلموں میں تھے۔ پروفیسر اے ایف رحمٰن بھی تاریخ کے پروفیسر تھے اور اپنی انگریزی دانی کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ بہت ہی شرمیلے اور شریف انسان، تقریر کرتے تو کسی پر نکتہ چینی نہیں کرتے لیکن امور کی وضاحت اس طرح کرتے کہ مخالف کے کام اعتراضات کا جواب آجاتا۔ رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں اور کئی اصحاب کا ذکر کیا ہے جن کو تفصیل سے گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں۔ ایسے اصحاب میں آغا حیدر حسن، سید آل عبا قادری، مسٹر رینل، ٹول صاحب اور دیگر ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۵: علی گڑھ کی نامور شخصیات کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیجئے۔

سوال ۶: اس اکائی کا تنقیدی مطالعہ کیجئے۔

جوابات: ۵ اور ۶: سوال ۵ اور ۶ کے جوابات 12.2.2 میں دیکھئے۔

12.3 عمومی جائزہ:

علی گڑھ کا یہ زمانہ وہ تھا جس میں کئی ایسی شخصیات تھیں جنہوں نے آگے چل کر ہندوستان کی قومی زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان میں اہم ترین نام ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا ہے جو آگے چل کر ہمارے صدر جمہوریہ ہوئے۔ طرابلس کی جنگ کے دوران ذاکر صاحب نے اپنے اسکول میں جوش وانہماک سے چندہ جمع کیا وہ ولولہ انگیز تقریر کیا کرتے تھے۔ بی اے کے امتحان میں ان کی پوزیشن آئی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی آبادکاری میں پھر ذاکر صاحب نے حصہ لیا۔ علی گڑھ چھوڑ کر ترکِ مولات کے موقع پر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ چلے گئے لیکن علیگڑھ کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی بہترین صلاحتیں صرف کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اہم ادارہ بنادیا، انہوں نے علیگڑھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اس طرح انہوں نے ایک درس گاہ کو نہیں ایک تہذیب کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اسی طرح پروفیسر انعام اللہ خاں تھے، جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ شریف النفس اور سادہ مزاج کے لیکن جذباتی۔ لباس نہایت معمولی کپڑے کا بناتے تھے۔ انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز اور مقبول معلموں میں ہوتا تھا۔ مولانا اقبال احمد خان سہیل کی شخصیت بھی یادگار تھی وہ نہایت شفیق، شریف النفس، ذہین اور ری علم تھے، دوستوں کے لئے ان کے دل میں وسعت، نرمی اور نوازش تھی۔ مولانا سہیل کو فارسی کے کلاسیکی ادب پر غیر معلومی عبور حاصل تھا۔ فارسی یم اے کرنے والوں کو مولانا اپنے طور پر خاقانی وعرفی کے قصیدے پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں غالبؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کی شاعری کے نکات سمجھانے میں کمال حاصل تھا۔ شاعری میں علامہ شبلیؔ اور تفہیم قرآن میں مولانا حمید الدین فراہی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ظہوری کی نثر اور ذوقؔ کی شاعری انہیں پسند نہ تھی۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کے شعروادب کا صحیح اور صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید کا علمی انداز عام کرنے نیز گفتگو اور روزمرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی کو ملحوظ رکھنے میں مولانا کو کمال حاصل تھا۔ انگریزوں، انگریزی حکومت اور انگریزی طور طریقوں سے بیزار تھے۔ وطن ماحول، خاندان، معتقدات، تعلیم وتربیت اور رہن سہن کے اعتبار سے قطعاً مشرقی اور مذہبی تھے۔

رشید احمد صدیقی علیگڑھ کے سچے عاشق ہیں انہوں نے علیگڑھ کی صرف خوبیاں دیکھیں اور انہی کو عام کیا۔ وہ یہاں کے کھیلوں، ادبی مصروفیات، مشاعروں، تعلیم وتدریس، طور طریق اور آداب اطوار کا نہایت

محبت سے ذکر کرتے ہیں، انہوں نے یہاں کی شخصیات کے بارے میں بھی اپنائیت کے ساتھ لکھا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات:

سوال ۵: علیگڑھ کے مشاعروں اور کھیلوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔

سوال ۶: اس اکائی کا عمومی جائزہ لیجئے۔

جوابات ۵، ۶: سوال ۵ اور ۶ کے جواب 12.3 میں دیکھئے۔

12.4 خلاصہ:

اس اکائی میں ہم نے آپ کے لئے علیگڑھ کے کرکٹ، مشاعروں اور وہاں کے نامور اصحاب کے بارمیں تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ رشید احمد صدیقی کی کرکٹ، سے دلچسپی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ علیگڑھ میں کرکٹ کو ممتاز حیثیت حاصل تھی یہ وہاں کی تہذیب تھی۔ آپ نے یہ بھی جان لیا کہ علی گڑھ میں مشاعرے بھی اہمیت رکھتے تھے۔ ہم نے بتایا کہ علی گڑھ میں مشاعرے کیسے ہوتے تھے۔ وہاں کہاں سے اور کیسے شاعر آتے اور وہاں کن شاعروں کو مقبولیت حاصل تھی۔ علیگڑھ نے کس طرح مشاعرہ کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس کو ایک مستحکم حیثیت عطا کی۔

رشید احمد صدیقی نے جن مختلف شخصیات کا اپنی خودنوشت میں جائزہ لیا، آپ نے اُن کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کی۔ سب سے پہلے آپ نے رشید احمد صدیقی کے گہرے دوست ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ذاکر صاحب کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ مولانا سہیل ذاکر صاحب اور رشید احمد صدیقی کے گہرے دوست تھے، اور نہایت ذہین اور قابل فردان ان کی صلاحیتوں سے بھی آپ نے آگہی حاصل کی۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں نمونہ امتحانی سولات بھی دیے گئے اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی۔ سفارشی کتب کے تحت آپ کے مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

سوال ۱: علیگڑھ میں کرکٹ کی مقبولیت کے بارے میں مضمون لکھئے۔

سوال ۲: رشید احمد صدیقی کے دوستوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، لکھئے،

سوال ۳: رشید احمد صدیقی اور علی گڑھ کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

12.6 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
سُریڈیشن	روایت	رسوا	بدنام
اتالیق	استاد، تربیت دینے والا		
مشاق	مشق کے ہوئے	ذی علم	علم والے
نشیب و فراز	اونچ نیچ	یگانگت	اتفاق، قرابت
بازآبادکاری	دوبارہ بسانا	تنقیح	تحقیق
انہماک	مصروفیت: محویت	نکات	نکتہ کی جمع، باریک بات
طنطنہ	رعب، شان و شوکت		

12.7 سفارشی کتب:

۱۔ نقوش رشید احمد صدیقی — پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

۲۔ رشید احمد صدیقی — پروفیسر عبدالحق

از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

وظیفہ یاب پروفیسر، حیدرآباد

NOTES

NOTES

ಆದೇಶ ಸಂಖ್ಯೆ : ಕರಾಮುವಿ/ಅಸಾವಿ/4–202/2014–2015 ದಿನಾಂಕ : 26–06–2014
ಒಳಪುಟ : 60 GSM ವೆಸ್ಟ್‌ಕೋಸ್ಟ್ ಪೇಪರ್ ಮತ್ತು ಹೊರಪುಟ : 220 GSM ಫಾರಿನ್ ಮ್ಯಾಟ್ ಆರ್ಟ್ ಕಾರ್ಡ್
ಮುದ್ರಕರು : ಪೂರ್ಣಿಮಾ ಪ್ರಿಂಟರ್ಸ್, ಬೆಂಗಳೂರು. ಪ್ರತಿಗಳು : 200

NOTES

KSOU NATIONAL INTERNATIONAL RECOGNITION

Karnataka State Open University (KSOU) was established on 1st June 1996 with the assent of H.E. Governor of Karnataka as a full fledged University in the Academic year 1996 vide Government notification No./EDI/UOV/dated 12th February 1996 (Karnataka State Open University Act – 1992). The Act was promulgated with the object to incorporate an Open University at the State Level for the introduction and promotion of Open University and Distance Education Systems in the education pattern of the State and the Country for the Co-ordination and determination of standard of such systems.

- With the virtue of KSOU Act of 1992, Karnataka State Open University is empowered to establish, maintain or recognize Institutions, Colleges, Regional Centres and Study Centres at such places in Karnataka and also open outside Karnataka at such places as it deems fit.
- All Academic Programmes offered by Karnataka State Open University are recognized by the Distance Education Council (DEC), Ministry of Human Resource Development (MHRD), New Delhi.
- Karnataka State Open University is a regular member of the Association of Indian Universities (AIU), New Delhi, since 1999.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Association of Commonwealth Universities (ACU), London, United Kingdom since 1999. Its member code number: ZKASOPENUINI.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Asian Association of Open Universities (AAOU), Beijing, CHINA, since 1999.
- Karnataka State Open University has association with Commonwealth of Learning (COL), Vancouver, CANADA, since 2003. COL is an intergovernmental organization created by commonwealth Heads of Government to encourage the development and sharing of open learning distance education knowledge, resources and technologies.

Higher Education To Everyone Everywhere

KSOU

Higher Education to everyone everywhere
ಉನ್ನತ ಶಿಕ್ಷಣ ಎಲ್ಲರಿಗೂ ಎಲ್ಲೆಡೆ

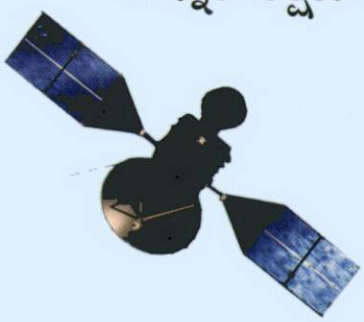

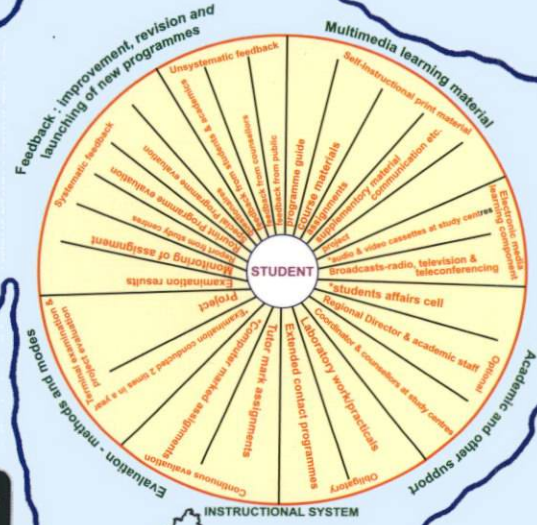

ಕರ್ನಾಟಕ ರಾಜ್ಯ ಮುಕ್ತ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾನಿಲಯ

ಮುಕ್ತಗಂಗೋತ್ರಿ, ಮೈಸೂರು – 570 006

Karnataka State Open University

Mukthagangothri, Mysore - 570 006. Website : www.ksoumysore.edu.in